قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :۔ ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ	خط وکتابت	۴
پاکستان/۸۴ روپے غیر ممالک/۹۸ روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور	چار روپے
جلد ۳۹	فروری ۱۹۸۶ء	شمارہ ۲۔

فہرست

۱۔ لمعات مفکرِ قرآنؒ کی یاد میں ——— ۲

۲۔ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا! (محترم پرویزؒ صاحب) ——— ۷

۳۔ ایک مفکرِ قرآن، اسلام کا مخلص خادم۔ (دین الحق قاضی صاحب) ——— ۹

۴۔ محاسبۂ خویش (ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۱۳

۵۔ فکرِ پرویزؒ (حسن عباس رضوی صاحب) ——— ۱۷

۶۔ میرا سرمایۂ حیات۔ (محترم پرویزؒ صاحب) ——— ۳۴

۷۔ ایک نئے انداز کا سپاسنامہ۔ (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر) ——— ۵۷

۸۔ فرقۂ اہلِ حدیث، صحیح احادیث کا منکر ہے۔ ——— (محمد شاہد عادل) ——— ۶۲

طابع۔ ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت، ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

لمعات

مُفکّرِ قرآنؒ کی یاد میں

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز صاحب پچھلے سال اسی ماہ ہم سے جدا ہوئے تھے، آپ کی رحلت، قرآن کے طالب علموں کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تھی جس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی۔ علامہ صاحبؒ سے بندہ کی آخری ملاقات دسمبر ۱۹۸۴ء میں ہوئی، اس وقت بیماری کی وجہ سے وہ کافی کمزور نظر آ رہے تھے۔

اس منظر کے دیکھنے کے بعد راقم کی پریشانی یقینی تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا، آپ نے فرمایا:

"بے شک میں اب چراغِ سحری ہوں، لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر سحر کے بعد صبح کی نمود ہوتی ہے۔ تم لوگ میری امید بن ہو، اس لئے مجھے یقینِ کامل ہے کہ میرے بجھنے کے بعد تاریکی نہ ہوگی، اُجالا ہی ہوگا۔"

ان خیالات کے اظہار کے بعد انہوں نے فرمایا کہ ہاں ایک حسرت ابھی تک دل میں باقی ہے اور وہ حسرت یہ ہے کہ اپنی زندگی میں "مفہوم القرآن" کا انگریزی ترجمہ اپنی نگرانی میں چھپواؤں اور پھر اس ترجمہ کو ساتھ لے کر یورپ کی کچھ یونیورسٹیوں میں خود جا کر اس کا تعارف کراؤں۔

کراچی سے کسی صاحب نے انہیں یہ ترجمہ کر کے پیش کیا تھا، لیکن اس پر انہیں اطمینان نہ ہوا تھا۔ وہ اس ترجمہ کو زیادہ بہتر بنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے امریکہ کی ایک یونیورسٹی پروفیسر کی خدمات حاصل کیں اور اپنی نگرانی میں مفہوم القرآن کا ترجمہ دوبارہ تیار کرانا شروع کیا۔ اس ترجمہ کے شروع کے چند صفحات، انہوں نے راقم کو دکھائے۔ تو عربی زبان کے مطابق اس میں کچھ خامیاں نظر آئیں، جن کی بندہ نے نشاندہی کر دی۔

اس پر آپ نے پنجابی زبان کا ایک فقرہ کہا جو اردو میں بھی مستعمل ہے کہ "جو بولے وہی کنڈی کھولے"۔ آپ نے مجھ سے فرمائش کی اس پروفیسر کو اچھی طرح عربی سکھا دو۔ بندہ نے ایک سال تک اس محترمہ کو عربی سکھانے کی پوری جدوجہد کی، لیکن اس معاملے میں وہ کوئی سنجیدہ نہ تھی۔ اس لئے "مفہوم القرآن" کے ترجمے کے کام کو مجبوراً روکنا پڑا۔ علامہ صاحبؒ

نے بندہ کے سپرد ایک دوسرا کام کر رکھا تھا، یہ کام احکام القرآن کی ترتیب تھی۔ جس کا نقشہ انہوں نے مرتب کیا تھا۔ اس سلسلے میں جتنا کام ہو چکا تھا وہ اس سے مطمئن تھے۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ اب میں کچھ خود غرضی سے کام لوں گا کیونکہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، ان کا اشارہ یہ تھا کہ میں احکام القرآن، والا کام ترک کر کے پہلے مفہوم القرآن کے ترجمے کو مکمل کرنے میں مدد دوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی بیماری میں افاقہ ہونے کی بجائے اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کی یہ حسرت ان کے دل ہی میں رہی، یہاں تک کہ وہ ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۸۲ سال تھی۔ عمر کے لحاظ سے صحت اچھی تھی اور آخری دم تک جوانوں کی طرح چلتے پھرتے رہے۔

علامہ صاحبؒ نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید پر غور کرنے اور اس فکر کو عام کرنے میں گزاری شروع شروع میں قدامت پسند علماء نے آپ کے علمی کام کی تعریف کی۔ اور آپ کے مضامین اس وقت کے سب سے بڑے دینی ماہنامے "معارف" اعظم گڑھ میں چھپنے شروع ہوئے۔ ان مضامین کی علمی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عدالتوں میں پیچیدہ دینی مسائل کے بارے میں عام طور پر آپ کے مضامین کا حوالہ دیا جاتا تھا۔

انہی مضامین میں سے ایک مضمون میکانکی اسلام، تھا جس میں آپ نے ضمناً نبی کی علمی تعریف بھی بیان کی تھی۔ ریاست بہاول پور کی عدالت میں آٹھ نو سال سے ایک مقدمہ چل رہا تھا، مقدمہ ایک مسلمان خاتون نے دائر کیا تھا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کر کے مرتد ہو چکا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ ڈسٹرکٹ جج بہاول نگر جس کی عدالت میں یہ مقدمہ دائر کیا گیا تھا، نبی کی جامع و مانع تعریف نہ ملنے کی وجہ سے اس مقدمے کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ آخر پرویز صاحب کا مذکورہ بالا مضمون پڑھنے سے اس کا شرح صدر ہو گیا۔ اور ۱۹۳۵ء میں اس نے مدعیہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ محترم جج نے اس مضمون کے سلسلے میں پرویز صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس طرح قادیانیوں کو کافر قرار دینے کی علمی بنیاد پہلے پہل، علامہ پرویز صاحبؒ نے مہیا کی تھی۔

اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد، ہندوستان کے علماء کے سرخیل مانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخباروں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے برصغیر کے چاروں کونوں میں اپنے علم کی دھاک بٹھا دی تھی۔ لیکن افسوس کے جلد ہی ہندو کانگریس کے لیڈر، اسلام کے اس مجاہد کو اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد تھا۔ وہ ان علماء کے ذریعے، مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

علامہ اقبالؒ کے دسمبر ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے خطبے کے بعد، پاکستان کا قیام، ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین بن چکا تھا۔ ہندو ہر صورت میں اس اسلامی مملکت

کے قیام کو روکنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے گاندھی جی، جو اس وقت ہندو کانگریس کے مسلّمہ لیڈر تھے، نے ایک لمبی منصوبہ بندی کی۔ منصوبہ بندی یہ تھی کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم کا بندوبست اس طرح پر کیا جائے کہ وہ پاکستان کے مطالبے کا خیال دل سے نکال دے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک تعلیمی سکیم تیار کی گئی جو اردھا تعلیمی سکیم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک دوسرے میں مدغم کرکے ایک قوم تیار کرنا تھا۔ مسلمانوں کی ثقافت کی زبان اردو کو ختم کرکے ایک بالکل ہی نئی زبان ہندوستانی کو مروج کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ مذاہب کے بارے میں نصاب میں یہ تصور دیا گیا، کہ عالمگیر سچائیاں، سارے مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام کے سپرد یہ خدمت ہوئی، کہ وہ اس عالمگیر سچائیوں والے تصور کو اجاگر کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی مشہور تفسیر ترجمان القرآن کی تالیف کا آغاز کیا۔

اس تفسیر کی پہلی جلد ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس جلد میں سورۃ الفاتحہ کی بڑی مفصّل تفسیر کی گئی اور اس کی بنیاد انہوں نے اسی نظریے پر رکھی کہ عالمگیر سچائیاں، دنیا کے ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں، اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

علامہ پرویز ہندو ذہنیت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا مقالہ ہندو کیا ہے ایک بلند علمی کوشش ہے۔ آپ نے اس تصوّر کے پیچھے گاندھی کی اردھا تعلیمی سکیم کی جھلک دیکھی۔ چنانچہ آپ نے اس تفسیر کو رد کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مولانا جو کچھ فرما رہے ہیں وہ قرآن کی تعلیم نہیں، ہندو مذہب کی یہ تعلیم ہو تو علیحدہ بات ہے۔ چنانچہ اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، جن کی اس وقت شہرت ثریا تک پہنچی ہوئی تھی، کے بارے میں کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اسلام کو ایک غلط مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن علامہ پرویزؒ کی یہ جرأت ایمانی تھی، کہ انہوں نے اس تفسیر پر تنقید کرکے مولانا کو بے نقاب کر دیا۔

علمائے دیوبند کی اکثریت کانگریسی ذہنیت رکھتی تھی انہیں مولانا ابوالکلام آزاد، جو اب کانگریس کے چوٹی کے لیڈر تھے، کے اس طرح بے نقاب ہونے پر بڑا دکھ ہوا اور وہ علامہ پرویزؒ کے

جانی دشمن بن گئے۔ پرویز صاحب نے اپنی ذات کو کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ ان کا مشن قرآنی فکر کو عام کرنا تھا جس کی علی الاعلان مخالفت کرنا علماء حضرات کے لئے ممکن نہ تھا، اس لئے انہوں نے علامہ صاحبؒ کے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ وہ سنّتِ رسول کے منکر ہیں اور احادیث کو نہیں مانتے۔ حالانکہ حقیقتِ حال اس کے برعکس تھی، ملوکیت نے اپنے استحکام کے لئے چونکہ بہت سی جھوٹی احادیث وضع کروائی تھیں اس لئے علامہ صاحب اس بارے میں احتیاط سے کام لیتے تھے، وہ صرف انہی احادیث کو صحیح تسلیم کرتے تھے، جو قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں وہ اکثر حضرت ابو حنیفہ کا حوالہ دیا کرتے تھے، جن کا حدیث قبول کرنے کا معیار بہت ہی کڑا تھا۔

اس سلسلے میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ہاں قرآن بہت ہی مظلوم ہے۔ تمام مولوی حضرات نام تو قرآن مجید کا لیتے ہیں لیکن عملاً ان کے نزدیک قرآن کی تعلیمات سے مراد فقہ کے مسائل ہوتے ہیں۔ جن میں سے بعض کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ الٹا مخالف ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کے بارے میں علماء کے اس قسم کے رویے کا حوالہ دیتے تھے۔ ان قوانین میں طلاقِ بدعت یعنی ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیکر بیوی کو فوری طور پر جُدا کر دینے کو خلافِ قانون قرار دیا گیا اور اس کے بدلے میں طلاق کے اس طریقے کی طرف رجوع کیا گیا، جس کی تفصیلات قرآن مجید میں ملتی ہیں اور سنّتِ رسول سے ان کی تائید ہوتی ہے، لیکن علماء حضرات نے قرآن و سنّت والے طریقے کو رد کر کے حنفی فقہ والے طریقے کو دوبارہ رائج کرانے پر اصرار کیا ان کے اس طرزِ عمل سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی کہ یہ حضرات قرآن و سنّت کا نام محض تبرکاً لیتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد، حنفی فقہ کے قوانین ہی ہوتے ہیں۔

ایسے معاشرے میں قرآن کی آواز لے کر اٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا، علامہ صاحب کو قدم قدم پر ان نیم تعلیم یافتہ مولوی حضرات کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ان کی مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں مشغول رہے۔ ان کی کوشش رائیگاں نہیں گئیں۔ مسلمان آہستہ آہستہ قرآنِ مجید میں کشش محسوس کرنے لگے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جب نیم خواندہ مولویوں نے قوم کا رجحان، قرآن مجید کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنے مدارس کے نام قرآنِ مجید سے موسوم کرنے شروع کر دیئے جیسے قرآن اکیڈیمی، ادارہ منہاج القرآن مدرسہ تعلیم القرآن وغیرہ۔

قرآنی فکر کے سلسلے میں پرویز صاحبؒ کا ٹھوس کام "معارف القرآن" کا سلسلہ ہے۔ اس کی ابتداء ۱۹۲۸ء میں ہوئی، اس سلسلے کی پہلی جلد کا موضوع اللہ تھا، جو بعد میں من و یزدان کے نام سے شائع ہوئی، پھر "ابلیس و آدم" تحریر کی جس میں حضرت آدم علیہ السلام، ابلیس،

ملائکہ، جن، شیاطین، وحی، رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد "جوئے نور" اور چوتھی جلد "برقِ طور" تھی۔ پانچویں جلد "شعلۂ مستور" میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء کرام کے حالات قرآنِ مجید کی روشنی میں مرتب فرمائے ہیں۔ اور اس سلسلے کی اہم کڑی "معراجِ انسانیت" ہے جس میں رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کو قرآنِ مجید کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کو سطحِ فوقیت قرار دینے سے بندہ کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی دوسری کاوشوں کی علمی حیثیت کچھ کم ہے۔ آپ کی سب تحریریں معیاری تھیں۔ لیکن "معارف القرآن" کا سلسلہ ایسا ہے کہ اگر مخالف بھی خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ کریں تو وہ ان کے علمی مرتبے سے انکار نہ کر سکے گا۔ یہ سلسلہ انہیں زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

(محمد شاہد عادل)

مفکرِ قرآن علیہ الرحمہ کی پہلی برسی!

بانیٔ ادارہ طلوعِ اسلام، مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کی جسمانی مفارقت مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو واقع ہوئی تھی، جس کی اطلاع ٹی وی، ریڈیو اور متعدد روزناموں میں نشر ہوئی اور بعد میں مجلّہ طلوعِ اسلام کے ماہناموں بابت مارچ تا اگست ۸۵ء بہ عنوان "داغوں کی بہار" (مسلسل) کے ماسوا، سینکڑوں پروانہ ہائے شمعِ قرآنی سے آمدہ انفرادی خطوط اور اجتماعی پیغامات (برائے تعزیت، نثر و نظم پر مشتمل) موصول ہو کر نشر ہوتے رہے۔ اسی سلسلہ میں وسط مارچ ۸۵ء اور ۱۲ اپریل اور پھر وسط نومبر ۸۵ء میں نمائندگان بزمہائے طلوعِ اسلام کے لاہور میں اجلاس منعقد کئے گئے تاکہ ادارہ طلوعِ اسلام کی سرگرمیاں حتی الامکان اسی منہج پر جاری رہیں جن پر خود مفکرِ قرآن نے انہیں قرآنِ کریم سے اپنے والہانہ لگاؤ سے قائم و دائم رکھا تھا۔ اس سانحۂ عظیم کو اب ایک سال ہونے کو ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحبؒ کی عظیم ملی خدمات اور قرآن کے حقائق پر نصف صدی کی کوہ کنی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے تجویز ہے کہ لاہور کے علاوہ بھی بزمہائے طلوعِ اسلام اپنے حلقہ ہائے اثر میں، اس موقعہ پر فکرِ پرویزؒ پر مبنی خطابات ٹیپس، VCR، پمفلٹس اور کتب متعلقہ کی اجتماعی طور پر نشر و اشاعت کریں۔ اس بارے میں ماہ فروری ۸۶ء کے طلوعِ اسلام میں ایسے مضامین یکجا ہیں جن سے قارئین کو اس رابطہ کو وسعت دینے میں سہولت ہوگی۔ مارچ ۸۶ء کے شمارے میں ادارہ ھذا میں برسی کے انعقاد کی رپورٹ کے علاوہ رابطۂ باہمی کے لئے دیگر بزمہائے سے متوقع کوائف بھی شامل ہوں گے۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام برسی کی تقریب ۲۸ فروری کو ہوگی، جس میں ایک خصوصی مقابلہ مضمون نویسی میں اوّل، دوم اور سوئم آنے والے مضامین پر انعامات بھی دیئے جائیں گے۔ عنوان اور تفاصیل کیلئے صد ۳۲ پر اعلان ملاحظہ فرمائیں، جسے چند روزناموں میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ والسلام

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

پرویز

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!

مروسال کے شمار سے میں ۹ر جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنی عمرِ رواں کے پچھتّر (۷۵) سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ طلوعِ اسلام کے صفحات میں ذکر کیا جاتا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے گولڈن جوبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ پچاس سالہ "جوبلی" دنیا کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور اس کی یاد سب سے زیادہ وجہِ نشاطِ روح ہے۔ اور نشاط و انبساط کے یہی وہ احساسات ہیں جن میں اپنے بے شمار دیدہ اور نادیدہ احباء و رفقا اور متفقین کو شریک کرنے کے لئے میں نے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے۔ میں جب ساحلِ عمر کے ریگِ رواں پر ان پچاس سالہ نقوش کو مرتسم دیکھتا ہوں تو حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے مجھ پر ایک عجیب والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مسرت اس احساس سے کہ میں نے زندگی کا جو مشن اپنے سامنے رکھا تھا اس میں مجھے اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے میرا سرِ نیاز اُس بارگاہ کے عتبۂ عالیہ پر بلیساختہ جھک جاتا ہے جس کی عطا کردہ راہ نمائی کے بغیر اس کامیابی کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور حیرت اس پر کہ تمام دنیاوی علائق کے باوجود (جن میں کم و بیش تیس سال ملازمت کے بھی شامل ہیں) میں نے، انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں، تن تنہا یہ طول طویل مسافت طے کیسے کر لی؛ اس قسم کے علمی، تحقیقاتی، فکری پروگرام کی تکمیل کے لئے جو میرے پیشِ نظر تھا، کس قدر ساز و یراق اور کتنے معاونین اور رفقائے کار کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب لین (EDWARD WILLIAM LANE) نے عربی زبان کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو انگلستان کے ایک نواب (DUKE OF NORTHUMBER LAND) نے یہ پیش کش کر دی کہ اس اسکیم کے سارے اخراجات اس کی جاگیر سے پورے کئے جائیں گے۔ علاوہ ازیں خود حکومتِ برطانیہ نے بھی مستقل عطیات سے اس میں اضافہ کر دیا۔ مالی تفکرات سے اس طرح آزاد ہونے کے بعد وہ مصر چلا گیا جہاں اسے، حکومتِ مصر کے تعاون سے ہر قسم کی علمی سہولتیں حاصل تھیں۔ اس طرح اس نے دن رات کی محنتِ شاقہ کے بعد بیس سال میں اپنا لغت مرتب کیا۔ (بدقسمتی سے وہ بھی حرف "ق" تک۔ بقیہ حروف کے وہ صرف نوٹ لکھ پایا تھا کہ اس کی وفات ہو گئی)۔ اس کی طباعت کیلئے اس نے اپنے بھتیجے (لین پول کو ـــ جو خود ایک ممتاز عالم تھا) متعین کیا۔ اس طرح اس لغت کی اشاعت ہوئی۔

میں نے قرآنِ کریم کا لغت ہی مرتب اور شائع نہیں کیا۔ اس کے علاوہ متعدد ضخیم تحقیقاتی تصانیف جن میں مفہوم القرآن۔ تبویب القرآن۔ مطالب الفرقان۔ معراجِ انسانیت۔ شاہکارِ رسالت جیسی ضخیم علمی اور فکری مطبوعات اور "انسان نے کیا سوچا" جیسی تحقیقاتی تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۹۳۸ء سے شائع ہونے والا ماہوار مجلہ طلوعِ اسلام۔ فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت سے متعلق عالمگیر تحریک۔ مسلسل درسِ قرآن کا سلسلہ۔ خطابات و تقاریر۔ وغیر ذالک۔ اور یہ سب نہ صرف انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں، کسی فکری رفیق کی معاونت کے بغیر، بلکہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) دنیاوی علائق کے باوجود، جن میں قریب تیس سالہ ملازمت بھی شامل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ میری صحت کبھی قابلِ رشک نہیں رہی، حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور کے چِلّوں، مراقبوں، ریاضتوں نے مجھے طرح طرح کے عوارض کی آماجگاہ بنا دیا اور سانپ کی ان لکیروں نے عمر بھر میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ان ریاضتوں سے البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اور وہ یہ کہ اپنے

مشن کی کامیابی کے لئے مجھے کامل انہماک اور ضبطِ خویش کی جس درویشانہ زندگی کی ضرورت تھی وہ مجھ پر کبھی گراں نہیں گذری۔ اور جن حالات سے بھی میں گذرا، مجھے اطمینانِ قلب حاصل رہا۔ حتیٰ کہ مخالفتوں کے ہجوم میں بھی میں کبھی پریشان خاطر نہیں ہوا۔ زندگی کی تعیش سامانیاں میرے لئے کبھی وجہ کشش نہیں ہوئیں۔ حالانکہ میں اگر چاہتا تو انہیں نہایت آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔ وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

یہ کچھ میں نے کیسے کر لیا؟ سچ پوچھئے تو منطقی توجیہات سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب میں خود بھی نہیں دے سکتا۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بے صوت آن دیکھی صدا مجھے بلاتی گئی اور میں این و آں سے بیگانہ، والہانہ طور پر اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس میں تھکنا تو ایک طرف میں کبھی سستانے کیلئے بھی نہیں رکا۔ بجز ان لمحات کے جن میں میں (علالت وغیرہ کی وجہ سے) بالکل معذور ہی نہ ہو گیا ہوں میں نے اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف رکھا۔ اس آواز میں کوئی ایسا سحر تھا کہ میں رک سکتا ہی نہیں تھا۔ یہ آواز خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم کی تھی جس کے ساتھ میرا قلبی لگاؤ عشق کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس میں کوئی عنصر فوق الفطرت نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے اس کا کوئی دعویٰ ہے۔ میں نے اس تذکرہ کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ جو متجسس قلوب میرے اس حاصلِ کشت کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھیں ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس میں کوئی بات غیر معمولی یا فوق البشر (SUPER-HUMAN) عنصر نہیں۔ انسان کے اندر اتنی بے پناہ صلاحیتیں مضمر ہیں جن کا اسے خود بھی علم و احساس نہیں ہوتا۔ اگر کسی مقصد کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ پیدا ہو جائے تو یہ صلاحیتیں خود بخود کار فرما ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں نے کیا ہے، وہ (بلکہ اس سے بھی زیادہ) ہر شخص کر سکتا ہے بشرطیکہ اپنے مقصد کے ساتھ اسے عشق ہو۔

زندگی کے اس طویل سفر میں ایک عجیب تجربہ بھی ہوا۔ اور وہ یہ کہ عمر کے آخری حصہ میں انسان کی جسمانی قوتوں کا مضمحل ہو جانا قانونِ فطرت کا تقاضا ہے لیکن اگر انسان نے اپنی زندگی فکری تحقیق میں طالب العلمانہ انداز سے گذاری ہو تو ان قوتوں کے انحطاط کے علی الرغم، اس کی فکری صلاحیتوں میں عجیب ارتقا اور انکار پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی فکری ارتقا اور جلا کا نتیجہ ہے جو میں [illegible] گو میری عمر اور صحت نے ایفا کیا اور فکری تخلیق کیلئے جو سہولتیں ضروری ہیں (اور جو اب تک مجھے کبھی میسر نہیں آئیں لیکن عمر کے اس حصے میں جو ناگزیر سی نظر آتی ہیں) وہ میسر آگئیں تو جتنا کچھ میں اب تک پیش کر سکا ہوں، اس پر نمایاں اضافہ کر سکوں گا۔ وبیدہ التوفیق۔

جن احباب نے میری زندگی کے اس طویل سفر میں کسی حیثیت سے بھی میری معاونت یا رفاقت کی ہے اس موقع پر ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کروں۔ نیز اپنے اس ایمان کا اعادہ بھی کہ خدا کی یہ کتاب عظیم (قرآن مجید) تمام نوع انسان کیلئے آخری، مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اور اس سے مستفید ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاروانِ انسانیت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جس پر اس ذاتِ اقدسؐ و اعظم (خدا کے آخری نبی۔ محمد رسول اللہ) کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں جسؐ نے اپنے حسنِ عمل سے بتا دیا کہ شرفِ انسانیت کی آخری منزل کونسی ہے اور ہدایتِ قرآن کی روشنی میں اس تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے۔

اور آخر میں عرق آلود پیشانی، جھکی ہوئی نگاہوں، کانپتے ہوئے ہاتھوں، اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ (اقبالؒ کی ہم نوائی میں) بحضور رب العزت یہ عرضداشت کہ:

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

آستانۂ قرآنیہ کا فقیر بے نوا

(۲۰ر جون ۱۹۷۶ء)

ایک مفکرِ قرآن اور اسلام کا مخلص خادم۔

غلام احمد پرویز

قیامِ پاکستان سے قبل میں ایک مسلم ہائی سکول میں مدرسِ دینیات تھا۔ میں سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کے پندرہ روزہ "ایمان" کا قاری تھا۔ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے کہ پندرہ روزہ ایمان میں چوہدری صاحب موصوف کا ایک مضمون چھپا۔ مضمون قرآنی انداز میں اور دل نشین پیرایہ میں تھا۔ مضمون کے نیچے تحریر تھا۔ از چوہدری غلام احمد بی۔ اے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ شملہ۔"

میں فیڈرل پبلک سروس کمشن کا امتحان دینے شملہ گیا۔ امتحان سے فارغ ہوکر دیگر اشخاص کے علاوہ چوہدری صاحب موصوف سے ملنے کا ارادہ تھا۔ میں اپنے ماموں (مسٹر این۔ اے قریشی) کے پاس ٹھہرا تھا۔ پتہ معلوم کیا۔ تھوڑی سی دقت کے بعد ہوم ڈیپارٹمنٹ کی عمارت تک پہنچ گیا۔ ملنے کا انتظام اچھا تھا۔ دفتر کے اندر داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ اندر والا خود باہر آکر ملتا تھا۔ برآمدے میں کھڑے کھڑے بات چیت کرنا تھا۔ چٹ اندر گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان جس کی عمر بمشکل ۳۰ سال ہوگی۔ شیروانی زیب تن کئے۔ سر پر سفید پگڑی کلاہ میں شملہ کے ساتھ باہر آئے اور کہا کون ہے۔ ملنے والا؟ میں آگے بڑھا۔ ہاتھ ملایا۔ مذکورہ مضمون کا ذکر کیا اور بات چیت شروع ہوگئی۔ بہت خوش ہوئے کہ میں قرآن کے حوالہ سے ملاقات کا خواہاں تھا۔ کسی ذاتی کام کے لئے نہیں آیا تھا۔ بات چیت کا انداز بالکل بے تکلفانہ۔ مربیانہ مشفقانہ اور بزرگانہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ان کو عرصہ سے جانتا تھا۔ اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ پھر باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مجلہ "طلوع اسلام" جاری ہوا۔ تو مجھے بھی ایک پرچہ بھیجا گیا۔ جس کا میں باقاعدہ خریدار بن گیا۔ ساری تحصیل میں صرف میرے پاس مجلہ آتا تھا۔ سٹاف کے ممبر خصوصاً ماسٹر دل محمد ثمر (بی اے۔ بی ٹی) مولوی فاضل صاحب (عربک ٹیچر) باری باری پڑھتے تھے۔ وہاں پر ایک انسپکٹر زراعت میاں عبدالعزیز تھے۔ وہ اس کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔

چوہدری صاحب موصوف فیڈرل حکومت میں مسلم نوجوانوں کی رہنمائی مدد۔ فلاح و بہبود کا بہت خیال رکھتے تھے مسلم نوجوان ہونا ان کی توجہ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ان کا نام ہر جگہ "پاس ورڈ" کا کام دیتا تھا۔ نئی دہلی میں ہر نیا مسلم نوجوان آنے والا جلد یا بدیر ان سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ ہر نوجوان خاص کر مسلم نوجوان ان کے خلوص۔ ان کے حوصلہ۔ ہمت ڈھارس سے متاثر ہوتا تھا۔

۱۹۳۸ء میں دوبارہ فیڈرل سروس کمشن کا امتحان دینے دہلی گیا۔ امتحان سے فارغ ہوکر ملا۔ اس وقت وہ تو دجہان روڈ پر مقیم تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ میں صبح سویرے کوارٹر پر پہنچا۔ اسطرح ملے گویا میرے انتظار میں تھے۔ بہت باتیں ہوئیں۔ انہوں نے مجھے سرائے میر اعظم گڑھ کا ماہوار رسالہ "الاصلاح" مطالعہ کرنے کی تلقین کی۔ میں اس کا خریدار بنا۔ اس زمانہ میں اس کو امین احسن اصلاحی تیار کرتے تھے۔ چونکہ میں قرول باغ میں

اپنے ماموں جان کے پاس ٹھہرا تھا۔ چوہدری صاحب نے مجھے حافظ محمد اسلم جیراجپوری قبلہ کا پتہ دیا اور ملنے کو کہا۔ قبلہ
ان دنوں جامعہ ملیہ کالج میں (اس وقت قرول باغ میں تھا) تاریخ اسلام اور اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ قرآن کریم
کے زبردست ماہر عربی لغت کے عالم۔ تاریخ اسلام کے زبردست شناور ("تاریخ الامت" ان کی ایک مستند کتاب
ہے) مختصر ملاقات میں ان سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ میں نے جلد محسوس کیا کہ چوہدری صاحب نے عربی لغت میں قبلہ حافظ
صاحب سے ضروری استفادہ کیا ہے۔

یکم اپریل ۱۹۴۰ء کو ہائی سکول چھوڑ کر ایک نیا سکول قائم کرنے کے سلسلہ میں دوسری جگہ چلا گیا۔ نئے سکول
کے بانی مبانی چوہدری صاحب موصوف کے بہت عقیدت مند تھے (اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور درجات
بلند کرے۔ آمین) وہ تھے ڈاکٹر عبدالواحد کیپٹن قبلہ۔

انہی دنوں معارف القرآن کی پہلی جلد کا غلغلہ بلند ہوا۔ میں نے ایک جلد منگوائی۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ چوہدری
صاحب موصوف ادیانِ عالم پر ایک زبردست مہارت رکھتے ہیں کیونکہ معارف القرآن کے طرزِ اسلوب، اندازِ تحریر
سے یہ بات بخوبی ظاہر تھی۔

اس زمانہ میں برصغیر کے طول و عرض میں پاکستان کے حوالے سے ایک قلمی جنگ جاری تھی۔ برصغیر کے تمام اخبارات
مسلم علماء باستثنائے چند سب پاکستان کے خلاف تھے۔ اُس وقت کے اخبارات کے فائل گواہ ہیں کہ پنجاب میں
"زمیندار" دہلی سے "الامان" اور مجلہ "طلوع اسلام" پاکستان کے نقیب تھے۔ باقی تمام پریس "ڈان" کے سوا
پاکستان کے خلاف تھے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقاء کے سوا باقی تمام علماء جمعیت علماء ہند، مجلس احرار، علمائے دیوبند
وغیرہ بالخصوص پاکستان کے خلاف تھے۔ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر گواہ ہے کہ ہوا کا رُخ کیا تھا، مجلہ طلوع اسلام
بڑی جرأت۔ دلیری۔ بے باکی سے سب مخالفین تحریک پاکستان سے قلمی جنگ بڑی کامیابی سے لڑتا رہا۔ اس
بے باکانہ مسلک کی بناء پر تمام علماء اور دینی مدارس چوہدری صاحب موصوف کے خلاف ہو گئے۔ عقل و دانش
کی جنگ تو نہ لڑ سکے۔ موصوف پر منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کر دیا۔

موصوف کی شہرہ آفاق کتاب "معراجِ انسانیت" اور "شاہکارِ رسالت" ایسی دو کُتب ہیں کہ جن میں جگہ
بجگہ حدیث کا حوالہ موجود ہے۔ ان کو منقول کہا گیا ہے۔ آپ کا مسلک حدیث کے متعلق بالکل متداول مسلک ہے
جس پر سابقین کاربند رہے اور بیسویں صدی کے پہلے ربع میں قبلہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت النبی جلد اوّل (چھوٹی
تختی) کے تقریباً ۱۰ صفحات حدیث کی اہمیت اور حدیث کے انکار پر لکھے ہیں۔ موصوف کا مسلک ۱۰۰٪ شبلی نعمانیؒ
کا مسلک ہے کہ ہر وہ حدیث جس کا نفسِ مضمون قرآن کریم کے متن کے خلاف ہوگا۔ قابلِ توجہ نہیں ہوگی۔ متقدمین
میں ملّا علی قاریؒ۔ متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شبلی نعمانیؒ اور جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا
مودودیؒ کا ہی مسلک رہا ہے۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ آپ کراچی آئے اور کیبنٹ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن
میں اسسٹنٹ سیکرٹری اور ڈپٹی سیکرٹری حکومتِ پاکستان ہوئے۔ فاؤلر لائن میں مقیم رہے۔ ہر اتوار کو آپ
کی قیام گاہ پر درسِ قرآن ہوتا تھا۔ پھر آپ کشمیر روڈ (پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس) پر منتقل ہوئے۔ درس کا سلسلہ برابر

جاری رہا۔ اس زمانہ میں مجھے ان کے قریب ہونے کا موقع نہ ملا۔ میری اپنی مجبوریاں مانع رہیں۔ پھر وہ لاہور چلے گئے گلبرگ نمبر ۲ - ب/۲۵ علمی اور دینی سرگرمیوں کا مرکز و محور رہا۔

موصوف نے تقریباً ۹۰ کے قریب اپنی تصنیفات چھوڑی ہیں جو اردو میں اسلامیات پر بہترین قیمتی سرمایہ ہے۔ شہرۂ آفاق کتب جن پر مصنف کو لازماً نوبل پرائز جیکا ہوتا اگر کسی حریت پسند ملک میں ہوتے۔ مگر وہ اس ملک میں رہے جو آزاد ہوا۔ مگر ذہنی، فکری، عملی طور پر برطانیہ کا غلام اور بندۂ بے دام ہے۔ ان میں سے کچھ درج ذیل کی جاتی ہیں۔

معارف القرآن	موازنۂ ادیانِ عالم پر ایک انقلاب انگیز کتاب۔
لغات القرآن	ایسی لغتِ قرآن جس کا اردو میں تا حال جواب نہیں ہے۔
مفہوم القرآن	ایک نادر کتاب
تبویب القرآن	۳ جلدیں۔ قرآن کے اہم عنوانات پر حرفِ تہجی کے مطابق ایک بےنظیر انڈکس قرآن کا
مطالب القرآن	کتاب کا نام ظاہر کرتا ہے۔ کہ کیا ہے !!!
معراجِ انسانیت شاہکارِ رسالت کتاب التقدیر	وہ انمول کتب ہیں کہ اگر موصوف کسی دوسرے ملک میں ہوتے تو کبھی کا لٹریچر میں نوبل پرائز مل چکا ہوتا۔ میں نے ایک دفعہ تاکیداً لکھا تھا کہ انگریزی ترجمہ ہو جائے تو ایوارڈ کے حقدار ہو جائیں گے۔

مگر موصوف اپنی مصروفیات کے پیشِ نظر ایسا نہ کر سکے۔[ص۱] مجھے معلوم ہوا ہے کہ کوئی صاحب ہیں جو اس کام کو سرانجام دے رہے ہیں

سلیم اور طاہرہ کے نام خطوط اور کئی دیگر تصانیف ہیں جو موصوف کے نام کو تا ابد باقی رکھیں گی۔ افسوس! قوم موصوف کو نہ سمجھ سکی۔ حکومت . . . . . . ان کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ ورنہ قرآن کالج قائم ہو جاتا اور ایک کلاس ان کی زیرِ نگرانی کورس پورا کر لیتی تو ملک میں ذہنی۔ دینی۔ معاشرتی۔ سیاسی انقلاب آ جاتا۔ ملک کے در و دیوار بدل جاتے۔ کاش! حکومت اور قوم کو ادراک و احساس ہوتا کہ ہم نے کیا کھو دیا !!!

ایسا نامور، علم دوست، قرآن کا خادم، اقبال کا شیدائی، مسلم نوجوان کا ہمدرد۔ پاکستان کا سچا پاسبان جو اسلام کی برتری۔ بزرگی۔ عظمت اور شوکت کے لئے پوری نصف صدی قلمی اور عملی جنگ تن تنہا لڑتا رہا گذشتہ فروری ۱۹۸۵ء میں ہم سے جدا ہو گیا۔ ایک سال گذر گیا۔ کاش! یونیورسٹی میں اس کے نام پر "اسلامیات" کی چیئر قائم کی جاتی یا ان کی نا تمام آرزو کہ "قرآنی کالج" کا ادارہ یا شعبہ وجود میں آتا! کاش ایسا ہو سکتا !!!

لاہور کے قیام کے دوران میرا ان سے مسلسل رابطہ قائم رہا۔ ان کے خطوط برابر پابندی سے آتے رہے۔ وہ ایک

ص۱ اس کے باوجود انگریزی زبان میں مفکرِ قرآن کی، اسلام کے موضوع پر واحد کتاب (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) جو موصوف کی ایک اور تصنیف "انسان نے کیا سوچا" کا جواب (REJOINDER) ہے، اسلام اور قرآن سے متعلق علمی حلقوں میں اس کی مقبولیت محتاجِ بیان نہیں (ادارہ)

درد مند علم دوست انسان تھے جن کا نمونہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا جسکا ان سے رابطہ قائم ہو جانا وہ پھر اس رابطہ کو توڑ نہیں سکتا تھا۔

اے اہل لاہور! آپ نے ظفر علی خاں کی گرج سنی۔ مولانا غلام احمد مرشد کی حق گوئی اور حق شناسی کو جانا اور پہچانا۔ قرآن کے عاشق اور اقبالؒ کے شیدائی کی تلمکاریاں دیکھیں۔ کیا آپ سب مردہ ہو گئے ہیں کہ ان جانے والوں کی قابل ستائش یادگار بھی قائم کر سکے۔ نہیں نہیں۔ ان کی تحریریں ہمیشہ ان کے کے نشان زدہ رستہ کو روشن رکھیں گی اور آنے والے اس روشنی پر قدم گامزن رکھیں گے۔

کاش! ہم سمجھ جائیں کہ ہم نے کیا کھویا!!!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!!

ان کے مجوزہ قرآن کالج کا ایک
متوقع طالبعلم
دین الحق قاضی

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اسکا بیشتر حصہ انہی خطوط کا رہین منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علوم حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلۂ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے ـــــ قیمت -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک ـــــ

(۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوع اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲۔ لاہور

محاسبۂ خویش

ہمارے باباجی جناب پرویز صاحب کو ہم سے جدا ہوئے ایک برس بیت گیا۔ وقت بھی عجب شے ہے سمجھنے کی نہ سمجھانے کی۔ سورج کا طلوع و غروب دنوں کو ہفتوں۔ مہینوں اور سالوں میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ وقت کی اس رفتار پر اگرچہ ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ مگر ہمارے احساسات و خیالات تو وقت سے متعلق ماضی و حال اور مستقبل پر حاوی رہتے ہیں۔ یہ اختیار ہمارا کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا۔ یہ وقت کتنا بھی آگے بڑھ جائے بیشک ہمارا ساتھ نہ دے۔ لیکن ہم سے جدا ہو جانے والی معزز و محترم نہایت شفیق و عزیز ہستیوں کی یاد تو کبھی ہم سے جدا نہیں ہوتی وہ تو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ وقت کی طرح ہمیں چھوڑ کر آگے نہیں بڑھ جاتی۔ ہم جانتے ہیں کہ باباجی اپنے وجود میں ہمارے سامنے نہیں رہے۔ مگر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اپنے چھوڑے ہوئے حسن عمل کے پیکر میں ہر وقت ہمارے سامنے رہتے ہیں۔ سال بیشک گزر گیا اور بلاشبہ اور بہت سے سال گزر جائیں گے۔ لیکن درس دیتے ہوئے باباجی ہماری نگاہوں سے کبھی چھپ نہیں سکتے۔ وہ تو اب بھی ہر جمعے کی صبح اسی طرح اپنی طبیعت کی شگفتگی، اپنے تخیلات کی پاکیزگی و بلندی اور اپنی آواز کی نرمی کے ساتھ ہمیں درس دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کا فیضان حسب سابق جاری ہے۔ خدا کی رحمت کا اس طرح شامل حال رہنا ہماری خوش بختی کی دلیل نہیں؟ ہم سب کو اس حقیقت کا علم ہے کہ باباجی نے پچاس سال کی طویل مدت تک اپنی فکرِ قرآنی اور بصیرتِ عرفانی سے ہماری رہنمائی کی۔ وہ ساری عمر قرآنِ مبین کے طالبعلم رہ کر حقائق کے موتی چنتے رہے۔ انہوں نے ہمہ وقت تن من دھن اسی راہ مستقیم پر لگائے رکھا خداوند رحیم و کریم کی کتابِ حکیم کو خود سمجھا اور ان سب کو سمجھایا جو اس کتاب اللہ کو سمجھنے کی طلب رکھتے تھے۔ اس طرح وہ زندگی بھر اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے خالص فکرِ قرآنی ہمارے قلوب و اذہان میں اتارتے رہے۔ اس تمام عرصے میں ہمارے دلوں نے جو روشنی حاصل کی ہے اور ہمارے ذہنوں کی جو تطہیر ہوئی ہے وہ یقیناً اور کلیتاً اسی منفرد مفکرِ قرآن کے علم و فہم اور فکر و شعور کی خوشہ چینی سے ہوئی ہے۔ ہم ان کا یہ احسانِ عظیم کبھی بھول نہیں سکتے جو انہوں نے قرآن کے بیان سے ہمیں غلط اور گمراہ کن عقائد، باطل تصورات اور جامد خیالات سے نجات دلانے کی صورت میں ہم پر کیا بیشک و شبہ ہم اس پر نازاں ہیں کہ ہمیں ایسے مشفق و مخلص، علم و فضل کے حامل معلم کا شاگرد بننا نصیب ہوا اور نصیب رہا اس کے نتیجے میں ہم در در بھٹکنے اور قدم قدم پر ٹھوکر کھانے سے محفوظ ہو گئے۔ ہم نے باباجی کی بصیرتِ اعلیٰ اور طبعِ رسا کی بدولت اپنے دامن ہائے، دل و دماغ قرآنی جواہر پاروں سے بھر لئے۔ ہمیں مسلمان کی زندگی کا اصل العین اور دستورِ حیات معلوم ہو گیا۔ ہمارے سامنے خالص قرآن کا راستہ آ گیا۔ پھر باباجی اپنے منصبِ ارضی کا فریضہ بہ حسن و خوبی ادا کر کے خدائی رحمتوں کے سائے تلے سفرِ آخرت کو روانہ ہو گئے۔ ان کے

لبعد ایک سال گزر گیا۔ اس گزرے سال میں کیا ہم نے قرآن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے رہنے کی سعی برقرار
رکھی یا اس رہنما کے دنیا سے منہ موڑنے پر ہم نے اپنے فریضے سے منہ موڑ لیا؟ یہ وہ نازک اور چبھتا سوال ہے
جو آج ہم نے خود سے کرنا ہے اور پوری دیانتداری سے خود ہی اس کا جواب بھی دینا ہے۔
بابا جی کی پہلی برسی کے موقع پر انہیں خراجِ عقیدت ادا کرنے کی صحیح اور عملی صورت اس کے سوا کوئی اور
نہیں کہ ہم محاسبۂ خویش کرتے ہوئے یہ دیکھیں (اس نظر کے ساتھ جس میں بصیرت بھی شامل ہو) کہ اس ایک برس
میں جو بابا جی کی رحلت کے بعد گزرا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ بابا جی کے مشن یعنی خالصتہً قرآن
کے انسانیت ساز پیغام کو عام کرنے میں کیا حصّہ لیا اور اس تحریکِ قرآنی کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے کیا تگ و تاز
کی۔ اپنے روشن ہوئے ذہنوں کے ذریعے اپنے گھروں میں کتنا اجالا پھیلایا! اپنے کردار کی پاکیزگی و پختگی کے حوالے
سے معاشرے کو کہاں تک عملی طور پر متاثر کیا۔ افرادِ معاشرہ کے سامنے ایمان و عمل کا کتنا عملی سبق پیش کیا۔
اس دانائے راز کے بعد ہمارے کرنے کے یہی اور دیگر اسی نہج کے کام تھے جو معاشرے کو قرآنی بنانے میں مددگار
ہو سکتے تھے۔ ہو سکتے ہیں۔ اور آئندہ ہو سکیں گے۔ کیا ہم نے اپنے روز و شب کے اعمال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے
اپنے اس اوّلین و آخرین فریضے کی ادائیگی پر بھی دھیان دیا؟ برعکس اس کے اگر ہم نے اپنی شامتِ اعمال کے
ہاتھوں اپنے خصوصی مزاجِ قومی کو ہی اپنا لیا ہے اور اپنے رہنماؤں کی یاد میں زبانی کلامی جوش و خروش کے خراج
ہی کو کافی جان لیا ہے اور اسی روش پر ہو لئے ہیں تو پھر قارئین عزیز! ہم اپنے فرائضِ مفوضہ سے کوتاہی کی کیا
صفائی پیش کر سکتے ہیں! اس موقع پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگر ہم واقعی اس تعلیمِ قرآنی کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں
جو ہم برس ہا برس بابا جی کی محنت و کاوش کی بدولت بڑی آسانی سے حاصل کرتے رہے۔ تو ہمیں اس غفلت سے
جاگنا ہوگا۔ اس گھر تک سے واپس لوٹنا ہوگا۔ ہمیں دیانت و صداقت کے ساتھ اپنا محاسبہ خود کرنا ہوگا پیشتر اس
کے کہ حساب کی گھڑی ہمارے سروں پر آن پہنچے اور مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے۔
بابا جی کے درسِ قرآنی کے سامعین کو یاد ہوگا کہ وہ درس دیتے ہوئے اکثر اس امر کی طرف توجہ دلاتے تھے
کہ قرآن کی تفسیر قرآن خود کرتا چلا جاتا ہے اور میں اسی کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے شوق سے سنتے
ہیں لیکن یاد رکھئے کہ صرف سن لینا کافی نہیں ہوتا۔ آپ کو چاہئے کہ درس سنتے ہوئے ساتھ کے ساتھ قرآنی آیات
کے حوالے اور اہم نکات نوٹ کرتے جائیں تاکہ بعد میں ان کی مدد سے آپ معارفِ قرآنی پر خود غور و خوض کر سکیں
جس کے نتیجے میں آپ کے لئے حق کا راستہ اختیار کرنا مشکل نہیں رہے گا۔ آپ بطیب خاطر کوشش اور
محنت سے خود قرآن کی طرف ایک قدم اٹھائیں گے تو وہ سو قدم آپ کی طرف آئے گا۔ بابا جی نے کئی دفعہ
ہمیں تنبیہ کی کہ دیکھو قرآن کے الفاظ سے یونہی نہ گزر جایا کرو۔ رک کر سوچو اور غور کرو۔ کہ قرآن کا
ایک ایک لفظ ہمارا دامن پکڑتا ہے۔ جناب پرویز صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ عزیزو! ان دروس کو محض
ذہنی تسلّی یا عارضی راحت نہ سمجھ بیٹھنا۔ یہ قرآن کے حقائق ہیں ان کو ذہن میں سنبھالو، دل میں اتار لو۔
کیا ہم نے ان سچائیوں پر عمل کیا؟ کیا ہم نے کبھی اپنے طور پر محنت کر کے قرآن سے ہدایت لینے کے لئے کوئی
وقت نکالا! کیا ہم نے از خود اس کتابِ مبین کا تدبّر و تفکر کے ساتھ مطالعہ کیا؟ جبکہ ہماری کیفیت تو یہ

رہا کہ ہم آرام و سہولت کیسا تھا! باجی کے درس سنتے رہے اور ذہنی تسکین حاصل کرتے رہے۔ شاید ہم اتنا ہی جانتے تھے۔ اسی خاطر ہم درس سننے آتے رہے اور درس سن کر خوش خوش جاتے رہے یہ سوچ کر کہ یہی ہماری ذمہ داری تھی۔ جسے ہم نے پورا کر دیا۔

آج کیوں نہ ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ ہم میں سے کتنے افراد ایسے ہوں گے جنہوں نے درس سے حاصل کردہ اسباق کا اطلاق اپنے معمولاتِ زندگی پر کیا ہو؛ کتنے ایسے ہوں گے جن کی زندگیوں نے ان دروس کے مطابق ترتیب و تشکیل پائی! ہاں ہیں جواب کون دے! ہم تو یہ بھی بھول گئے کہ ہمارے باباجی نے ہمیں قرآنی بہن بھائی کے خطاب سے نوازا تھا۔ اسی لئے ناکہ قرآنی ہونے کی ذمہ داری پوری کرتے رہیں قرآن کو پیشِ نظر رکھنے کا حق ادا کرتے رہیں۔ تو میرے قرآنی بہن بھائیو! علم حاصل کرنا بے معنی ہو جاتا ہے اگر اس سے ہمارے عمل کی تزئین نہ ہو۔ یہ باتیں ہمارے سوچنے کی ہیں۔ سوچنا اور عمل کرنا ہی تو ایمان کا مقصود ہے یہی تو مسلمان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ پرویز صاحب قرآن کے اس عظیم فرمان "تتفکروا" یعنی سوچو اور غور کرو، پر کسقدر زور دیا کرتے تھے اور کس شرح و بسط کے ساتھ قرآنی تعلیم کے اس ماحصل پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہ غور و فکر ہی ہے جس کے ذریعے انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت و عمل سے طے کیا جاتا ہے۔ مگر ہماری دشواری تو بہ حیثیت مجموعی یہ ہے کہ ہم تن آسان و تساہل پسند سوچنے اور غور و فکر کرنے سے بھی گھبراتے ہیں اور فرار چاہتے ہیں کیونکہ غور و فکر بجائے خود ایک ایسا عمل ہے جس میں انسانی ذہن کو بڑی محنت و مشقت کرنا ہوتی ہے۔ اس "دردسری" سے بچنے کے لئے ہم سوچ سے واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم نے تو سوچ اور فکر کا خانہ ہی دماغ کا خالی کر دیا ہے کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ ایسا کرتے ہوئے ہم یہ بھلا دیتے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے ان لوگوں کا مقام جہنم بتایا ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم ہزار خود فریبی میں مبتلا رہیں قرآن کی حقیقتیں تو اٹل ہیں۔ نہ کوئی انہیں جھٹلا سکتا ہے۔ نہ ان سے کہیں بھاگ سکتا ہے۔ سورۂ اعراف میں جہنم کے سزاوار لوگوں کی وضاحت ہمارے سامنے ہے۔

یہ کون لوگ ہیں وہ جو لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں لیکن اسے کام میں نہیں لاتے۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ یہ لوگ انسان نہیں حیوانات کی مانند ہوتے ہیں بَلْ هُمْ أَضَلُّ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ اس لئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ خدا لگتی کہیئے! کیا ان آیات بینات میں ہمیں مکمل طور پر اپنی اور اپنے معاشرے کی تصویر نظر نہیں آتی؟! مت بھولئے کہ ہم سامعین درس کی تو خصوصاً اس لحاظ سے دوہری پکڑ ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کی تمام تر روشنی حاصل کرنے کے باوجود کتاب اللہ کے ہر لفظ۔ ہر آیت۔ ہر سورۃ کو بار بار سمجھائے جانے کے باوصف نہ صرف یہ کہ معاشرے کی تاریکیوں یعنی قرآن سے مہجوریوں کو دور کرنے کی طرف ہم نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ خود ہمارے قدم بھی آگے

بڑھنے کی بجائے وہیں رُکے رہ گئے ہیں۔ کیا یہی صلہ دینے کی اذفات تھی ہماری اس مفکرِ قرآن کی ریاضت کا۔ کیا یہ سوچنے اور سمجھنے کا مقام نہیں کہ ہمیں کرنا کیا تھا اور ہم کر کیا رہے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اصلاح کا دار و مدار احساسِ ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ جونہی انسان اس احساس سے بیگانہ ہوا، اس کیلئے اچھائی اور برائی کی تفریق ختم ہوئی۔ پھر کیسی ذمہ داری اور کن فرائض کی بجا آوری! پھر سب کچھ تسکین کا تنور بھرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ پھر مقصودِ حیات روپیہ پیسہ کمانا، دھن دولت بٹورنا اور پنشن یا افتادہ مفادات حاصل کرنا رہ جاتا ہے۔ اس مایوس کن صورتِ حال کے باوجود اگر ہمارے اندر روشنی کی کوئی کرن موجود ہے تو ہمیں یہ حقیقت نظر آسکتی ہے کہ انسانیت کی تباہی و بربادی کا بنیادی سبب انسان میں احساسِ ذمہ داری کا فقدان ہوتا ہے۔ آج ہم اس مرض کا شکار ہیں۔ اس کا واحد علاج خود احتسابی یا محاسبۂ خویش ہے جسمیں ہمیں ہر سانس کا حساب دینا ہے اور ہر عمل کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔ اسی سے تو ہمارے اندر زندہ رہنے اور جدوجہد کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے تو ہم رکاوٹوں اور مخالفتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں (اقبالؒ نے کہا تھا) صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم۔ کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب۔ یاد رکھئے! ہمارا ہر سانس ہماری زندگی کو بناتا ہے یا بگاڑتا ہے۔ ہمارے ہر لمحے ہر ساعت کی خوبی یا خامی ہمارے اپنے قول و فعل پر مبنی ہوتی ہے۔ پھر کیوں نہ ہم اپنے اس اختیار سے خیر کی طرف رجوع کریں۔ خود بھی اس راستے پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ ہمارے سامنے تو قرآن کا یہ اٹل اصول ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ یہ یقینی بات ہے کہ غلط کاموں کے تخریبی نتائج کی تلافی اچھے کام کرنے سے ہوتی ہے۔

مایوسیاں کہیں خارج سے نازل نہیں ہوا کرتیں۔ انسان خود اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مایوس وہی ہوتا ہے جو روشنی ہوتے ہوئے بھی اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے۔ جو فکر و شعور سے منہ موڑ کر عقل و فہم کا دامن چھوڑ کر اپنے ذہن کو مفلوج اور قلب کو مقفل کر لیتا ہے۔ مگر ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ ہم کیوں ایسا کریں! ہم بفضلِ تعالیٰ زندہ ہیں۔ ہمارے پاس وقت اور کام کرنے کی توانائی باقی ہے۔ ہمیں ابھی مہلت حاصل ہے۔ ہمارے پاس ہمیشہ رہنے والی روشنی موجود و محفوظ ہے۔ ہم مفاہیم قرآن اور مطالب فرقان سے بے بہرہ نہیں۔ ہمارے باباجی کی فکرِ قرآنی کے انمول درخشندہ نقوش ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتے ہوئے ہماری رہبری کے لئے موجود ہیں۔ پھر یہ تمام نعمتیں رکھتے ہوئے یہ تذبذب کیسا؟ یہ ہچکچاہٹ کیوں؟ اٹھئے! اس جمود کو توڑیے جو خواہ مخواہ اپنے اوپر طاری کر لیا ہے۔ غفلت کی چادر ہٹائیے جس نے روشنی کو روک رکھا ہے۔ اٹھئے! کہ آج ہمیں ازسرِنو اپنے دلوں سے عزمِ صمیم کے ساتھ یہ عہد کرنا ہے کہ ہم باباجی کی روشن کردہ قندیل کو بجھنے نہیں دیں گے۔ ہم اس مشنِ قرآنی کو پورے عالمِ انسانیت میں جاری و ساری رکھیں گے۔ ہر ممکن استطاعت و استقامت کے ساتھ ہمیں یہ ذمہ داری ادا کرنا ہے۔ یہی تمنا تھی اس محقق و مفکرِ قرآن کی۔ ہمارا یہ عہد ہے کہ ہم نخلِ تمنا کو سیراب کرتے رہیں گے۔

آئیے! سوچ سمجھ کر ایک دوسرے کی رفاقت میں ہم قرآنی بہن بھائی اس صراطِ مستقیم پر قدم بڑھائیں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

ثریا عندلیب

فکرِ پرویز

برادرانِ عزیز!

اس محفلِ قرآنی میں آج اس مردِ قلندر کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے میخانۂ حجاز کی ٹوٹی پھوٹی صراحیوں کی ٹھیکریاں جمع کر کے ان پر لکھی ہوئی داستانِ پارینہ کو ازسرِ نو مرتب کیا۔ اور دنیائے انسانیت کو وہ فکرِ روشن عطا کی جس سے بیگانہ ہو کر وہ جہالت کی تاریکی میں دم توڑ رہی تھی۔ ہاں وہ مردِ قلندر جس نے کاروانِ حیات کو منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لئے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کر دی جس نے فلسفۂ زندگی کا ایک مکمل مفہوم دے دیا۔ جس نے کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کے اسرار بے نقاب کر دیئے اور ما فیہا کا سینہ چاک کر کے رموزِ فطرت آفتابِ حقائق میں رکھ کر انسانیت کے سامنے بے مزد و معاوضہ رکھ دیئے انسان نے جو اپنے آپ کو مجبور و مقہور تصور کرتا تھا اس قلندر کی دی ہوئی روشنی کی بدولت اپنی خودی کو فلک الافلاک کی بلندیوں پہ جلوہ بار دیکھ لیا اور یہ خاک نشیں آسمانوں پر کمندیں پھینکنے لگا۔ اور جب اس کے سامنے اسرار و رموزِ کائنات بے نقاب ہوئے تو وہ بے ساختہ پکار اٹھا ؎

مردِ راہداں

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور، اے ہمتِ مردانہ!!

یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن نے زندگی کا منتہائے مقصود قرار دیا ہے۔

اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی (۵۳/۴۲)

اور یہی وہ مقام ہے جہاں ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
ہوتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

یہ سب کچھ جس مردِ قلندر کی عرق ریزی اور شبانہ روز محنت سے ہمیں مفت ہاتھ

آیا۔ اُس کو ہم اور آپ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں پرویز کہتے ہیں۔ اس مردِ راہداں نے ہم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ ہمیں کبھی کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ اگر کچھ کہا تو صرف اتنا کہا ؎

سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا!

قرآن اور معاشیات

فکرِ پرویز کے متنوع گوشے ہیں اور ان میں سے ہر گوشہ مختلف کیفیات کا حامل ہے۔ اس لئے اگر اس فکر کو جامع طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت لاحق ہوگی اور یہ اس وقت ناممکن ہے اس لئے میں اس کے صرف ایک گوشے سے متعلق گفتگو کروں گا۔ یہ وہ گوشہ ہے جسے ہماری طبیعی زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی معاشی مسئلہ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پرویز صاحب نے قرآن حکیم کا جو مفہوم یا تفسیر پیش کی ہے اس کی بنیاد معاشیات پر رکھی گئی ہے اور جس معاملہ پر بھی بحث کی گئی ہے اُس میں معاشی پہلو غالب ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض لاعلمی یا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ فکرِ پرویز زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ زندگی کا معاشی پہلو ایسی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے واقعی اسی شد و مد سے پیش کیا جانا چاہیئے تھا۔ جہاں تک میرے حقیر مطالعہ کا تعلق ہے، کوئی بھی نظامِ حیات بغیر معاشیات کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس سے معاشیات کو الگ کر دیا جائے تو وہ نظام رزمگاہِ ابلاس بن کر رہ جاتا ہے

برادرانِ عزیز! اسلام بھی ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیاد اور اساس ان قوانین و ہدایات پر ہے جو قرآن حکیم میں عطا کئے گئے ہیں۔ قرآن ان قوانین و ہدایات کے اتباع کا لازمی صلہ اس دنیا میں رزق یعنے سامانِ زیست کی فراوانی قرار دیتا ہے اور ان قوانین سے روگردانی کا نتیجہ سامانِ زیست سے محرومی بتاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کی رُو سے جو قوم رزق کی دولت سے مالا مال ہے اس پر خدا کا انعام ہے۔ اور جو بھوک اور افلاس میں مبتلا ہے اس پر خدا کا عذاب ہے۔ اس حقیقت کو ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً۔ اللہ تعالےٰ ایک مثال کے ذریعے اس طرح سمجھاتا ہے

قَرْیَۃً کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً

ایک بستی تھی جو نہایت امن اور سلامتی کی حالت میں تھی

یَاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ

اس کے لئے سامانِ زیست (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔

فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ

پھر جب اس کے رہنے والوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکر گزاری کی تو اس جرم کی پاداش میں۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۳)

اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ اور یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

دیکھا آپ نے، اللہ تعالیٰ کس طرح معاشی استحکام کی فراوانی کو اپنا انعام اور بھوک اور فلاس یعنی معاشی ناہمواری کو اپنے عذاب سے تعبیر کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کا معاشی پہلو ایک ایسی پرکھ ہے جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قانونِ خداوندی کا صحیح معنوں میں اتباع ہو رہا ہے یا نہیں۔

اس حقیقت کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ (۲۰/۱۲۴)

جو ہمارے قانون سے اعراض برتتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اسے قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہو گا بلکہ اس سے بھی گیا گزرا۔

قانونِ الٰہی کے نفاذ کا مقصد

آگے بڑھنے سے پہلے میں قرآن حکیم کے دو اور مقامات آپ کے سامنے لاتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نظامِ حیات کے معاشی پہلو کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ نہ صرف اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کو اس دنیاوی زندگی میں اپنے نظام کا نقطۂ ماسکہ قرار دیتا ہے۔

قرآنی احکامات کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کا اتباع کرنے سے انسان کا انفرادی اخلاق سنورتا ہے اور یہی انسان کی ارتقاء کا آخری مقام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان احکامات کی اطاعت سے انسان کا انفرادی اخلاق سنورتا ہے۔ لیکن سنورے ہوئے اخلاق مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک اور بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں اس طرح واضح کیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۲/۱۸۳)

اے وہ لوگو! جن کا اس حقیقت پر یقین ہے کہ اخلاق صرف قانونِ خداوندی کی پیروی کرنے

ہی سے سنورتا ہے، تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح اقوامِ سابقہ پر تاکہ تمہارا کریکٹر بلند ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کریکٹر بلند ہو بھی گیا تو پھر کیا ہوگا لیکن بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ کریکٹر اس لئے بلند کرنا مقصود ہے کہ ایک فعّال جماعت معرضِ وجود میں آئے۔ کہ

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

باطل نظام مٹ جائے اور اس دنیا میں خدا کا اقتدار و اختیار قائم ہو جائے۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالےٰ محض اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے ایسی جماعت کی تشکیل چاہتا ہے۔ بات یہ نہیں۔ اس کا اقتدار و اختیار تو پہلے ہی تمام کائنات پر قائم ہے۔ وہ یہ سب کچھ چاہتا ہے بنی نوعِ انسان کی بھلائی کی خاطر وہ انسانی دنیا میں ایسے نظام کی تشکیل چاہتا ہے جس کا ضابطہ قوانین قرآن حکیم ہو۔ متذکرہ بالا آیت کا آخری ٹکڑا اللہ تعالےٰ کے اس اقتدار اور اختیار کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

تاکہ تم اپنی محنت کے بھرپور نتائج دیکھ سکو۔

صلوٰۃ موسےٰؑ

یہی وہ نظام تھا جس کے قیام کے لئے حضرت موسےٰؑ کو چنا گیا۔ سب سے پہلی وحی میں ہی خدا نے حضرت موسےٰؑ پر واضح کر دیا تھا۔

اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى

دیکھ میں نے تجھے اپنی رسالت کے لئے چن لیا ہے بس جو کچھ وحی کیا جاتا ہے اسے غور سے سن،

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝

میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی حاکم اور معبود نہیں میری ہی عبودیت اختیار کرو۔ میرے قانون کو غالب کرنے کے لئے صلوٰۃ قائم کرو۔

وہ صلوٰۃ کیا تھی جس کے قیام کو حضرت موسےٰؑ کی بعثت کی وجہ بیان کیا گیا۔ وہ صلوٰۃ یہ تھی:

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (۲۰/۱۵-۱۳)

یاد رکھو تمہارے ہاتھوں سے ایک عظیم انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب جو اب تک غیر مرئی طور پر ارتقائی منازل طے کرتا چلا آ رہا تھا، نکھر کر سامنے آ جائے۔ اس انقلاب سے مقصود یہ ہے کہ ہر فرد اپنی محنت کے بھرپور نتائج حاصل کر سکے اور کوئی آدمی اپنی محنت کے پھل سے محروم نہ رہے۔ (لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا یہی مفہوم ہے)

اُممِ سابقہ کی اس تاریخ کی رُو سے جو قرآن میں محفوظ ہے، نظامِ خداوندی سے

مقصود یہ ہے کہ ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے جس میں رزق کی فراوانی ہو۔ اور ایسے معاشرہ کے قیام کے لئے ایک خطۂ ارض کی ضرورت لاینفک ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی صحرا نوردیاں اور ان کی تلاطم خیز داستانِ جہاد شاہد ہے کہ وہ ایک ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں وقف اضطراب رہے، جہاں بنی اسرائیل کو آباد کیا جا سکے اور پھر وہاں وہ نظام قائم کیا جائے جس کے لئے اللہ نے ان کو مامور کیا ہے۔

مطالبۂ پاکستان

اب عہد حاضر کی تاریخ کو سامنے لائیے۔ اور سوچئے کہ آپ نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ اس مطالبہ کی ابتداء سرسید علیہ الرحمۃ نے کی تھی جب انہوں نے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کو کہا تھا۔

"اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ بغض اور عناد ان ہندوؤں کے سبب سے ابھرے گا جو تعلیمیا فتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

اُس مردِ غازی کی پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک خطبہ کے دوران پاکستان کا منصوبہ پیش کر دیا۔ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد کے سلسلہ میں علامہ مرحوم نے وفات سے ایک سال پہلے قائداعظمؒ کو ایک خط میں لکھا:۔

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔ لیگ کا مستقبل اس پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق رہیں گے شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریقہ سے سمجھا جائے اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد قائداعظمؒ نے پاکستان میں مجوزہ نظام کے بارے میں ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ دہلی سیشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رَو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی

پر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ عوام کی محنت غضب کرنے کا جذبہ ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے۔ اگر پاکستان کا یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا اشتراک صرف پاکستان کے نظریہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے اندر جو نظام قائم ہونا تھا وہ اُس پر بھی ہم آہنگ تھے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جسے پرویز صاحب اس شد و مد سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت معاشی ہمواری تھی۔

ملک کے استحکام کا مطلب ملکی معیشت کا استحکام

آپ نے دیکھا کہ اسلامی نظام میں معاشیات کو کتنا دخل ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کوئی ملک ہو، کوئی بھی نظام ہو، اس کی امن وسلامتی کا راز اس کی معیشت کے استحکام میں مضمر ہے۔ اس کی خوشحالی کا دار و مدار اس کی معاشی حالت پر ہے۔ اس کے باشندوں کی نشو و نما کا انحصار اس ملک کی معاشیات پر ہے۔ اور معاشیات کا انحصار ملک کے ذرائع پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) پر ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں "خزائن الارض" پر ہے اور خزائن الارض سے پورا پورا فائدہ صرف اور صرف اُسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب وہ افراد کی بجائے قرآنی نظام کی تحویل میں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب نے معاشیات کو اولیں اہمیت کا حامل قرار دیا ہے اور قرآن کریم کے ان گوشوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کیا جن کا تعلق اسلامی نظام کی معیشت سے ہے۔ ان جواہر ریزوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بعنوان "نظام ربوبیت" میں انہوں نے ایک متعین پروگرام پیش کیا ہے۔ ان سے پہلے ایسی کوشش کسی نے نہیں کی۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا عملی پروگرام اسی کتاب پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں نظامِ حیات کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ چونکہ اس پروگرام کے خطوط آپ کے رگ وپے میں سرایت کر چکے ہیں، میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ البتہ محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں ان کا خلاصہ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

نظامِ ربوبیت کیا ہے؟

فرماتے ہیں:۔

(۱) اس نظام کی رُو سے قرآن ایک ایسے معاشرے

کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ (اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)

۲۔ کوئی فرد، بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

۳۔ معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت، علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا قیمت انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشاء حصولِ علم کے علاوہ فرد کی ذات کا استحکام اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

۴۔ ربوبیت عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رُو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے قرآنی معاشرے کی تحویل میں رہیں، تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اس کو قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے"۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات تجویز کرتا ہے جو افراد کی معاشی ہمواری کا ضامن ہے۔ وہ اس کا واحد حل یہ بتاتا ہے کہ تمام ذرائع آمدن، وسائل پیداوار، اور رزق کے سرچشمے نظامِ اسلامی کی تحویل میں ہوں اور وہاں سے ہر چیز حسبِ ضرورت افرادِ معاشرہ میں مساویانہ تقسیم ہو۔ اس طرح کوئی فرد دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوگا۔

بقا کس نظام کو ہے؟

برادرانِ عزیز! تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں مقابلہ نظامہائے حیات کے مابین ہوتا ہے نہ کہ ذاتی عقائد اور مذاہب کے درمیان۔ جو نظام امنِ عالم اور سلامتی کی ضمانت دیتا ہے، دنیا اس کی طرف جھکتی ہے۔ آپ کے عقائد بظاہر کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں، جب تک آپ کے پاس انسان کی خوشحالی کے لئے ٹھوس نظام نہیں ہوگا، آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جس نظام نے افراد کی ضرورت سے چشم پوشی کی وہ نظام کبھی پنپ نہیں سکا۔ کیونکہ:۔

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ط (۱۳/۱۷)

بقا اسی کو ہے جو بنی نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔

تجربہ گاہِ چین

ضمناً ایک بات یاد آ گئی۔ کئی برس پہلے پاکستان کے ایک سابق وزیر تجارت جب عوامی جمہوریہ چین کے دورہ

سے واپس آئے تو انہوں نے چین کی خوشحالی کا خوب چرچا کیا۔ پھر ایک بیان میں انہوں نے یہ کہا کہ اگر اب میں چین گیا تو اس بات کا مطالبہ کروں گا کہ چین میں جرائم کس طرح ختم ہو گئے۔ ہمارے ہاں ایک بزرگ ماسٹر فقیر محمد صاحب تشریف لاتے ہیں۔ وہ بزم کے رکن تو نہیں لیکن پابندی سے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے خیال میں چین میں جرائم ختم ہو جانے کی کیا وجوہات ہیں؟ میں نے کہا یہ معلوم کرنے کے لئے چین واپس جانا محض تضیعِ اوقات ہے۔ اس کی وجہ تو بالکل ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ چین نے اپنا معاشی نظام ہموار کر لیا ہے جس سے جرائم ختم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جرائم ایک طرف افراطِ زر کی پیداوار ہوتے ہیں اور دوسری طرف محتاجی اور ناداری کے۔

دوسرا سوال

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں جو عام طور پر محترم پرویز صاحب کے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کے متعلق کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "کیا کبھی ایسا نظام قائم ہوا تھا جسے طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے؟" اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اگر ہمارا ایمان ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کی زندگیاں اور اعمال قرآن کے مطابق تھیں تو ہمارے پاس اس حقیقت سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نظام ضرور قائم ہوا تھا۔ اگر ہم تک اس کی شہادت نہیں پہنچی تو یہ تاریخ کا قصور ہے جس نے صحیح واقعات ہم تک نہیں پہنچائے۔ مگر اس عدم ثبوت کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن ایسا نظام پیش نہیں کرتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن حکیم وہ ضابطۂ حیات ہے جو ہر مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے اس لئے یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ایسے نظام کے متعلق ہدایات اس میں نہ ہوں۔

قرآنی شواہد

اب آیئے ان تاریخی شواہد کی طرف جنہیں قرآن کریم نے محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ وہ تاریخی شواہد ہیں جنہیں بطورِ سند پیش کیا گیا ہے۔ کاش سوال کرنے والے ہماری بجائے کبھی قرآن کی بارگاہ سے پوچھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن ہمیں اس دور سے کہیں اور پیچھے لے جاتا ہے اور کہتا ہے:-

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۱۲/۳)

(اے پیغمبرؐ!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگزشتیں سناتے ہیں۔ اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگزشتوں سے) پہلے بے خبر تھے۔

تجربہ گاہِ مصر

اس کے بعد قرآن اس قصہ کی مختلف کڑیاں بیان کرتے ہوئے اس مقام پر آتا ہے جہاں اصل واقعہ کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ مصر کے قید خانے میں بند تھے۔ شاہِ مصر کو خواب آیا کہ سات گائیں موٹی تازی ہیں اور ان کو سات دبلی گائیں نگل رہی ہیں۔ سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی ہیں۔ بادشاہ خواب سے بہت پریشان ہوا۔ اہلِ دربار کوئی تعبیر بیان نہ کر سکے۔ وہاں ساقیوں کا ایک سردار بھی تھا جو کبھی حضرت یوسف کے ساتھ قید میں رہ چکا تھا۔ اور اس کے خواب کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی تھی۔ وہ بول اٹھا۔ " میں اس خواب کا نتیجہ بتلا دوں گا مجھے ذرا قید خانہ تک جانے دو۔" وہ حضرت یوسف کے پاس گیا۔ اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھی۔ حضرت یوسفؑ نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ خواب کی تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی بتا دی کہ :۔

" سات برس تک تم لگاتار کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ جب کاٹنے کا وقت آئے تو جو کچھ کاٹو اسے اس کی بالوں میں ہی رہنے دو۔ صرف اتنی مقدار الگ کر لیا کرو جو تمہارے کھانے کے لئے ضروری ہو۔ پھر اس کے بعد سات سال سخت مصیبت کے آئیں گے اور وہ سب ذخیرہ کھا جائیں گے جو تم نے پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا، مگر تھوڑا سا جو تم روک سکو گے بچ جائے گا۔ پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب بارشیں آئیں گی۔ لوگ اس میں پھلوں اور دانوں کا عرق نکالیں گے۔ (۱۲/۴۷-۴۹) (قرآنی فیصلے جلد سوم میں دیکھئے نظام یوسفی)

یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس کے لئے ایک جامع منصوبہ (PLAN) کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ذرائع پیداوار تو عوام کی نجی تحویل میں تھے۔ ان کی روک تھام کے لئے اگر کوئی قدم حکومت کی طرف سے اٹھایا جاتا یعنی راشن یا کنٹرول نافذ کر دیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ لوگ ایسے حکم کو نہ مانتے اس کی مثال موجودہ دور میں آپ کے سامنے ہے حکومت گرانی یا کسی اور وجہ سے اشیاء کی تقسیم اور قیمتوں کی حدود مقرر کر دیتی ہے۔ لیکن اشیاء چونکہ افراد کی نجی ملکیت ہوتی ہیں۔ یہ افراد کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کریں یا نہ کریں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے احکام کی تعمیل نہیں کرتے۔ اشیاء منڈی سے نابود ہو جاتی ہیں ــــ اور حکومت کا کنٹرول اور راشن سسٹم منہ دیکھتا رہ جاتا ہے یہ اس لئے ہوتا ہے کہ چیزیں افراد کی ہوتی ہیں اور کنٹرول حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ جہاں ثنویت (DUALISM) ہو نتیجہ ظاہر ہے۔

نسخۂ کیمیا

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک اور صرف ایک حل تجویز کیا اور وہ یہ کہ بعد از تحقیقات جب حضرت یوسفؑ کی عصمت کی تصدیق ہو گئی۔ اور وہ شاہ مصر سے

ملے تو شاہِ مصر نے ان کی عظمت کا اقرار کرنے کے بعد ان سے مشورہ طلب کیا کہ یہ جو مصیبت اس خطۂ ارض پر آنے والی ہے اس کی روک تھام کیسے ہو۔ حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ وہ منزل آگئی ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں تجارب کی ان گنت بھٹیوں سے گزار کر تیار کیا تھا تو نظامِ ربوبیت کے عظیم منصوبہ کا ایک گوشہ ان کی نگاہوں کے سامنے آگیا۔ بلا تامل فرمایا۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ - (۱۲/۵۵)

ملک کے حدود میں جتنے بھی وسائلِ پیداوار اور ذرائع آمدنی ہیں ان کو قومیا (NATIONALIZE) کر میری تحویل میں دے دیجئے۔ کیونکہ مجھے ان کی حفاظت، اور ان کے محاصل کا صحیح مصرف کا علم دیا گیا ہے۔

"خزائن الارض" ایک بڑی جامع اصطلاح ہے اس میں ہر وہ کاروبار اور شعبہ شامل ہے جو آمدن کا ذریعہ ہو اور ان میں ام الخزائن "زمین" ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں ہر وہ محکمہ بھی شامل ہے جس کا تعلق مالیات اور اقتصادیات سے ہے۔

حسنِ انتظام

قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لئے "خزائن الارض" کو میری تحویل میں دے دیجئے۔ اس لئے ان کی حفاظت اور مصرف کا مجھے علم دیا گیا ہے۔ ان کو اپنی تحویل میں لینے اور قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا طریقِ عمل اختیار کیا اس کی تفصیل تورات میں اسطرح ہے۔

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لئے کہ وہاں کال ایسا سخت تھا۔ کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملکِ مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی۔ اس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا، جمع کیا اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی ختم ہو گئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا۔ کہ ہم کو روٹی دو کہ آپ کے ہوتے ہوئے کیوں مریں۔ کہ نقدی چک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو۔ اگر نقدی چک گئی کہ میں تمہارے چوپائیوں کے بدلے میں تمہیں دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کے پاس لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکریوں اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے ان سب چوپاؤں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا — وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا خرچ ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلّے بھی لے لئے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران

نہ ہو جائے۔ اور یوسفؑ نے ساری زمین فرعون کے لئے مول لے لی کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی۔ کہ کال نے ان کو نیٹ تنگ کیا تھا سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لئے مول لیا لو یہ بیج تمہارے لئے ہیں۔ کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو۔ اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں۔ اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے ساری مصر کی زمین کے لئے یہ آئین جو آج کے دن تک مقرر ہے۔ کہ فرعون پانچواں حصہ لیگا مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

(کتاب پیدائش۔ باب ۴۷)

درمحترم پرویز صاحب کے الفاظ میں:۔

حضرت یوسفؑ نے جب علت مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمین حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچا دیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشتکار اپنی محنت کے ماحصل کے آپ مالک تھے۔ صرف پیداوار کا پانچواں حصہ حکومت کو دینا پڑتا تھا تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشتکار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح سے حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا جو دبلی گائیوں کو کھائے جا رہی تھیں۔

(قرآنی فیصلے)

آپ نے غور کیا کہ سرزمین مصر کس قدر شدید قحط سے دوچار تھی اور یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت یوسفؑ کے حسن انتظام کی وجہ سے نہ صرف خطۂ مصر بھوک اور افلاس کے بحران سے محفوظ رہا بلکہ بیرونی ممالک کے لئے بھی نجات ثابت ہوا۔ کیونکہ تورات کے بیان کے مطابق اس وقت قریباً تمام ممالک قحط کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ کتاب پیدائش باب ۴۱ میں لکھا ہے۔

"اور سات برس سستی کے جو زمین مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے ساتھ برس جیسا

سفؑ نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین گرانی ہوئی۔ ریسنوز مصر کی ساری زمین
ردلیٹ تھی۔ پھر جب ساری زمین بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لئے فرعون کے آگے
لٰی۔ فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسفؑ کے پاس جاؤ۔ وہ جو تمہیں کہے سو کرو۔ اور تمام
سے زمین پہ کال تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مصر کی زمین پہ کال بہت پڑا تھا اور سارے ملک مصر
یوسف کے مول لینے آئے کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔"

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ پہلے سات سالوں میں فصل باقاعدہ ہوتی رہی اس میں سے ضرورت
غلہ استعمال میں بھی آتا رہا۔ اور ضرورت پوری کرنے کے بعد جو بچتا وہ جمع کر لیا جاتا اور سات
گوداموں میں صرف وہ غلّہ موجود تھا جو ضروریات پوری کرنے کے بعد بچا تھا۔ اب سات سال
ن میں بچائے ہوئے غلّہ سے اہل مصر کی ضرورت بھی پوری کی جاتیں تھیں اور بیرونی ممالک کے ہاتھوں
جاتا تھا۔ پہلے سات سالوں میں صرف شدہ غلّہ سے جو کمی واقع ہو جاتی تھی۔ وہ کمی نئے سال کی فصل
ہو جاتی تھی۔ لیکن قحط کے دنوں میں غلّہ صرف ہی ہوتا تھا۔ اضافہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ صرف پس انداز کیا
ایک دانہ کے اضافہ کبسانہ سا سال لگاتار اندرون ملک میں بھی استعمال ہوتا رہا اور بیرون ممالک
بھی پوری کرتا رہا۔ اس طرح سات سال کی فصل چودہ سال میں جن میں سات سال قحط سالی
اہل مصر اور نواحی ممالک کے لئے خوراک مہیا کرتی رہی۔ اسطرح حضرت یوسفؑ کے ہاتھوں
مصر میں نظامِ ربوبیت قائم ہو گیا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ۔ (۱۲/۵۶)

ان عزیز! قرآن نے صرف چودہ سال ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس نظام کی بدولت
ہی متلاطم موجوں کے تھپیڑوں کو بادِ شرطہ کے جانفزا جھونکے سمجھتی ہوئی ساحلِ مراد تک جا
یقیناً اپنی ہمہ گیر خوبیوں کے ساتھ مصر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی رائج ہو گیا ہو
ہے کہ جب حضورؐ کے زمانہ میں اور بعد ازاں خلافتِ راشدہ کے وقت تمام ممالک میں غلّہ
تھی۔ تو یہیں سے حجاز اور دوسرے ممالک کو اونٹوں کے ذریعہ غلّہ پہنچایا جاتا تھا یہ اس
صدقہ تھا جس سے مصریوں کو حضرت یوسفؑ نے روشناس کرایا تھا۔

یہی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں

جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ایسا نظام کبھی قائم ہوا تھا۔
جو طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب پیش کرتے ہیں۔
وہ عہد یوسفی کے نظام ربوبیت کو دیکھیں جس کی جزئیات تک قرآن کریم نے محفوظ کر دی ہیں
عظیم واقعہ کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلاتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ (۱۲/۷)

…مرکزی کردار

جو پائے صداقت کے لئے اس قصہ میں بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

آج بھی وہ نسخہ کیمیا قرآن کی دفتین میں بعینہٖ موجود ہے جسے دنیا آزما چکی ہے اور شفا حاصل کر چکی ہے اگر آج بھی وہ نسخہ استعمال کیا جائے تو وہی نتائج برآمد ہوں گے جو عہد یوسفی میں تجربہ گاہ مصر میں ہو چکے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب وہ سرزمین ہنگامی صورت حال سے دوچار تھی۔ اگر معمول کے حالات میں ایسے نظام کو آزمایا جائے تو اس سے کہیں بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ یہی وہ نسخہ کیمیا (نظام ربوبیت) ہے جسے محترم پرویز صاحب نے بیاض قرآن سے تجویز کیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا کی نظروں نے اسے دیکھا ہے اور اب بھی یہ دنیا اسی فردوس گم گشتہ کی تلاش میں یہ کہتی ہوئی سرگرداں ہے کہ ؎

وہ جو ساتھ تیرے گزر گئی اسی زندگی کی تلاش ہے۔

قوموں کی موت

لیکن برادران عزیز! فردوس گم گشتہ کی بازیابی کے لئے بڑے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کسی قوم کا خون منجمد ہو جاتا ہے اور جوش کردار سرد پڑ جاتا ہے۔ قرآن نے قوموں کی اس کیفیت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ موت ایسی ہوتی ہے جو زندگی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ حکیم الامت نے کہا ہے۔ ؎

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

مردہ قومیں کس طرح زندہ ہوتی ہیں

مردہ قوموں کی از سرِ نو زندگی کو قرآنِ حکیم نے بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب حضرت ابراہیمؑ قوم کو راہِ راست پر لانے کی ہر کوشش کر چکے تھے۔ مگر قوم ان کے پیش کردہ دین پر کان نہیں دھرتی تھی۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ (۲/۲۶۰)

(وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیمؑ نے عرض کیا، اے میرے نشوونما دینے والے تو ایسی مردہ قوموں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ (اس پر پوچھا گیا۔ اے ابراہیمؑ! کیا تجھے اس بات پر یقین نہیں؟ عرض کیا میرا اس پر یقین محکم ہے۔ میں تو فقط اپنی سابقہ کارکردگی کا جائزہ لے کر آپ سے مزید ہدایات چاہتا ہوں تاکہ ہدایات پاکر اطمینانِ قلب کے ساتھ آگے بڑھوں۔ ارشاد ہوا کہ ایسی قوموں کے افراد پر کسی بلانے والے کی آواز کا اسی طرح اثر ہوگا جس طرح مثلاً تو چار پرندے لے۔ پھر تو ان کو (TAME) کر یعنی اس طرح پرورش کر کہ وہ پوری طرح تیرے ساتھ مانوس ہو جائیں پھر ان چاروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف پہاڑوں پر مقرر کر پھر دیکھ جب تو ان کو بلائے گا وہ کس طرح تیری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔"

ذرا آگے بڑھیے۔ ایک بلبل کے بچے کو پنجرے میں بند کر دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پنجرے کی دیواروں

سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جائے گا۔ لیکن جب آپ اس کو باقاعدہ تربیت اور خوراک دیتے رہیں گے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ آپ بازار سے گزر رہے ہوں گے اور وہ بلبل آپ کے سر پہ اڑتا ہوا جائے گا۔ اس کی مانوسیت کا یہ عالم ہو گا کہ آپ اسے پنجرہ دکھائیں گے جس کی دیواروں سے وہ سر ٹکراتا تھا — وہ دوڑتا ہوا آئے گا اور اسے جنت سمجھتے ہوئے اس میں داخل ہو جائے گا۔ باز ایک خونخوار پرندہ ہے وہ آبادی کے قریب نہیں آتا۔ مگر جب اس کی تربیت کی جائے تو مانوس ہونا تو درکنار وہ انسان کے لئے شکار پکڑ کر لاتا ہے۔

متذکرہ قرآنی مثال بھی اسی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ وہ قوم جو حق کا پیغام دینے والوں کی تضحیک اور استہزا کرتی ہے۔ جب اس کی مناسب تعلیم و تربیت کی جائے۔ تو جب بھی کوئی داعی حق اس کو پکارے گا وہ لوگ زمین کے چاروں گوشوں سے اس کی طرف بھاگتے ہوئے آئیں گے۔ لیکن برادران عزیز! جب قوم کے افراد کی صحیح تعلیم و تربیت نہ ہو وہ کس طرح حق کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ کس طرح قانون خداوندی کے دست بازو بن سکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے تمثیلی قصہ میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ انقلاب تعلیم و تربیت ہی کے ذریعے رونما ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی صحرا نوردیاں اس پر شاہد ہیں اور سب سے بڑھ کر اسوۂ محمدیؐ اس پر دلیل ہے۔ حضورؐ نے قوم کو کس طرح تیار کیا۔ قرآن کی زبان میں:-

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲)

تعلیمی درسگاہ کی ضرورت

پاکستان کے معمار اول سرسید علیہ الرحمۃ نے اسی سنت نبویؐ پر عمل کیا اور علی گڑھ میں ایک تعلیمی درسگاہ کی بنیاد رکھی — جس کا نتیجہ پاکستان کی شکل میں برآمد ہوا۔ پاکستان تو حاصل ہو گیا۔ لیکن جس کام کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، وہ کام ابھی باقی ہے اور وہ کام ہے **نظام ربوبیت کا قیام** — جسے حضرت یوسفؑ نے قائم کیا۔ اور جسے حضرت نبی اکرم ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری شکل دی — اور جس کے داعی آج محترم پرویز صاحب ہیں۔ سرسید نے علی گڑھ درس گاہ قائم کی تو پاکستان بنا۔ اب ایک ایسی درسگاہ کی ضرورت ہے جو ایسی جماعت تیار کر سکے۔ جس کے ہاتھوں سرزمین پاکستان میں نظام ربوبیت قائم ہو جائے۔

یہ درس گاہ ایسے طالب علم تیار کرے کہ:-

۱۔ پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کون سی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے اور

۲۔ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی، بین الاقوامی مسائل سے دوچا

ہیں اور جس کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآن حکیم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نکتۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی راہنمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید مثال پیش کر سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرت نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطورِ اسوۂ حسنہ رکھ لیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

مردِ قلندر کا وارث

محترم پرویز صاحب اب عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جس کا شدید تقاضا یہ ہے کہ ان کا وارث مقرر کر دیا جائے۔ اپنے محسنِ اعظم کی تحسین وتحمید، اس کی پیش کردہ فکرِ قرآنی کی سپاس گزاری اور اس پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ پرویز صاحب کی زندگی ہی میں ان کا وارث مقرر کر دیا جائے ــــ لامحالہ ان کے وارث ایک یا دو اشخاص نہیں ہو سکتے بلکہ وہ درسگاہ ہی ہو سکتی ہے جو ایسی قوم تیار کرے جو فکرِ پرویز کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے۔ جن کے متعلق وہ علامہ اقبال کی زبان میں اکثر کہا کرتے تھے۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے!
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

۲۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

مقابلہ مضمون نویسی

بیادِ علامہ غلام احمد پرویز مرحوم

پاکستان کی معاشی مشکلات

اور

اُن کا قرآنی حل

مضمون چار ہزار الفاظ سے متجاوز نہ ہو۔ مقابلہ میں یونیورسٹی اور کالج کے طلباء و طالبات حصہ لے سکتے ہیں۔ مضامین دستی یا بذریعہ ڈاک، ۱۵ فروری ۸۶ء تک ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور پہنچ جائیں۔ اوّل، دوم و سوم آنے والے مضامین پر بالترتیب ۲۰۰۰، ۱۵۰۰ اور ۱۰۰۰ روپے نقد انعام دیا جائے گا۔

انعامات، علامہ پرویز مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریب بمورخہ ۲۸ فروری ۱۹۸۶ء میں دیئے جائیں گے۔

منجانب:۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

بزمہائے طلوعِ اسلام توجّہ فرمائیں

چاہیئے تو یہ تھا کہ برادرم باباجی مرحوم ومغفور کی وفات کے فوراً ہی بعد میری عزیزہ بیٹی سلمٰی پرویز ادارہ طلوعِ اسلام کا اکاؤنٹ میرے یعنی اپنے اباجی کے حوالے کردیتی لیکن افسوس کہ گیارہ ماہ کی طویل مدت تک ایسا نہ ہوا اور ادارہ مذکورہ کا اکاؤنٹ نمبر ۷۵ــ۲۶۰ عزیزہ بیٹی سلمٰی پرویز کے پاس رہا۔ اس دوران ادارہ کے لئے ایک ایگزیکٹو کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور اسی دوران ادارہ کی رجسٹریشن بھی ہوئی۔

اب گیارہ ماہ کی طویل مدت کے بعد ادارہ کا پرانا اکاؤنٹ بینک کے قانون کے مطابق مورخہ ۸۶ــ۱ــ۱۹ کو بند کرکے ختم کردیا گیا ہے اور مورخہ ۸۶ــ۱ــ۱۹ کو ہی میں نے یعنی عارف بٹالوی نے ادارہ طلوعِ اسلام کے پروپرائیٹر کی حیثیت سے ادارہ طلوعِ اسلام کا اسی حبیب بینک میں نیا اکاؤنٹ کھلوا لیا ہے جس کا نمبر ۶۲ــ۳۹۴۶ ہے۔ اب ادارہ طلوع اسلام کی نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔ اور سابقہ اکاؤنٹ کے ساتھ ہی ادارہ طلوعِ اسلام کی رجسٹریشن اور ادارہ کی ایگزیکٹو کمیٹی ختم ہو چکے ہیں۔

اب میں برادرم مرحوم کی جگہ ادارہ طلوعِ اسلام کے پروپرائیٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھال چکا ہوں۔ اب ادارہ طلوعِ اسلام اسی انداز اسی طریق اور اسی نوعیت سے چلے گا اور کام کرے گا جس انداز سے مرحوم ومغفور باباجی کی زندگی میں کارفرما تھا۔ مجھے کامل بھروسہ ہے کہ آپ بزرگ حضرات اور مخلص احباب کا دلی خلوص اور تعاون حاصل رہے گا۔

میں اپنے آپ کو اس قطرہ کی مثل پاتا ہوں جو بیرونِ دریا کچھ حیثیت و حقیقت نہیں رکھتا لیکن دریا میں جذب ہوکر خود دریا بن جاتا ہے

تحریکِ طلوعِ اسلام کا سپاہی
عارف بٹالوی

پروپرائیٹر ادارہ طلوع اسلام بی/۲۵ گلبرگ II لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرا سرمایۂ حیات

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زند

ہمرہانِ قافلۂ قرآنی و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت

میری طبعی عمر پچھتر سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ ذکر ہو، یا کسی خصوصیت کی حامل۔ قابلِ ذکر بات صرف یہ ہے کہ اس میں قریب پچاس سال کا عرصہ ایسا ہے جو قرآن کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے وقف رہا۔ میری قرآنی فکر سے متفق احباب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس دن کی یاد منانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کی اس معصوم سی خواہش کا احترام ضروری سمجھا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس تقریب کو (جسے وہ قرآنی فکر کی گولڈن جوبلی کہہ کر پکارتے ہیں) نہایت سادگی سے منائیں۔ کہ یہ اجتماع اسی تقریب کا مظہر ہے۔ میرے لئے درحقیقت یہ تقریب ہے، بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکرانہ بجا لانے کی جس کی فیض گستری سے مجھے یہ توفیق نصیب ہوئی کہ میری زندگی کا اچھا حصّہ اُس کی کتابِ عظیم کے افہام و تفہیم میں بسر ہوا۔ اور ساتھ ہی اظہارِ تشکر اپنے ان رفقاء کا جو ان طول و طویل مسافتوں میں فکری طور پر میرے شریکِ سفر رہے۔ میرے ان احباب کا تقاضا تھا کہ میں آج کے خطاب میں ان منازل کی کچھ جھلکیاں پیش کروں جن سے گذر کر میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔ اگرچہ میں ان نشاناتِ راہ کا جستہ جستہ تذکرہ اس سے پہلے بھی مختلف مقامات پر کر چکا ہوں، لیکن بپاسِ خاطرِ احباب انہیں مختصر الفاظ میں دُہرا دیا جاتا ہے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میرے بعد اگر کوئی راہرو اس راستہ پر گامزن ہونے کا شوق اور ارادہ رکھے تو میرے نقوشِ قدم کو دیکھ کر اس کا حوصلہ بندھ جائے کہ یہ راہ نامانوس نہیں۔ اس پر اس سے پہلے بھی کوئی گذرا ہے

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہو گا

میری پیدائش (۹ر جولائی ۱۹۰۳ء کو) ضلع گورداسپور کے مشہور قصبہ بٹالہ میں ہوئی جو اب
ـرقی پنجاب کا حصہ بن چکا ہے۔ بٹالہ ویسے ہی بڑا مذہبی شہر تھا۔ پھر میری پیدائش اور تعلیم و تربیت
ـس ماحول میں ہوئی وہ شریعت اور طریقت دونوں کی قدامت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے دادا
ـیہ الرحمۃ) حنفی مسلک کے ایک جید عالم، چشتیہ خانوادہ کے ایک ممتاز صوفی اور اس کے ساتھ
ـں ایک حاذق طبیب بھی تھے۔ لیکن انھوں نے ان میں سے کسی کو بھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا کیونکہ
ـہ صلاح و خدمتِ خلق کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مجھے اپنے علم اور سلوک کا وارث
ـنا چاہتے تھے اس لئے چھوٹی سی عمر ہی سے میری تعلیم شروع ہوگئی۔ مجھ سے سلوک کی منزلیں کس
ـرح طے کرائی گئیں یہ ایک الگ داستان ہے۔ جہاں تک علومِ شریعت اور تفسیر قرآن مجید کا تعلق ہے،
ـن کی تعلیم ٹھیٹھ قدامت پرستانہ انداز سے ہوئی اور میں تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے ہم سنوں سے
ـیں آگے نکل گیا۔ یہ بات موجبِ صد مسرّت اور باعثِ صد افتخار ہونی چاہیئے تھی لیکن مجھے ایک اور مشکل کا سامنا
ـے۔ چمنستانِ فطرت میں جو شاخ میرے حصے میں آئی تھی، اس پر ذہن رسا کے گلِ سرسبد کے ساتھ ناقدانہ
ـہ کے کانٹے بھی پیوست تھے۔ قدامت پرستانہ اندازِ تعلیم کا تقاضا تھا کہ جو کچھ بتایا جائے اُسے
ـس لئے صحیح مانو کہ فلاں امام، فلاں محدث یا فلاں مفسر نے اسی طرح فرمایا ہے۔ اور میری تنقیدی نگاہ
ـہ عمل یہ ہوتا تھا کہ صحیح تو اسی بات کو مانا جا سکتا ہے جس کے صحیح ہونے کے لئے کوئی دلیل موجود ہو۔
ـں کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا سینہ شروع ہی سے اسلاف پرستی کی اندھی تقلید اور دلیل طلبی کے پامال شدہ
ـنوں کی کش مکش کی آماجگاہ بننا شروع ہو گیا۔ لیکن میری مشکل یہ تھی کہ اُس زمانے میں، میں اس اندرونی
ـش مکش کو زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ دادا جان (مرحوم) کا احترام گلوگیر ہو جاتا۔ اس تمام اثنا میں میری
ـی کی راتیں اور عمر کے دن اسی کش مکش میں گذر گئے۔

میرے کوائفِ حیات میں بعض ایسے واقعات سامنے آئیں گے جنہیں جس کا جی چاہے اتفاقی حوادث
ـے تعبیر کرلے اور جس کا جی چاہے مشیّت کے پروگرام کی کڑیاں کہہ کر پکار لے۔ ان کی بہر حال کوئی
ـیہہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ انہی واقعات میں ایک وہ تھا جس کا میں ابھی ابھی ذکر کروں گا اور جو میری
ـی کے دھارے کا رُخ بدلنے کا بنیادی طور پر محرک ہوا۔

ـلامہ اقبالؒ کا نقشِ اوّلیں

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبالؒ کی پہلی مثنوی — اسرارِ خودی
شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے حافظؔ کے خلاف جو اشعار
ـے تھے، ملک کے تصوّف زدہ حلقوں کی طرف سے ان پر مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ
ـں کہہ چکا ہوں، میرے دادا جان بلند پایہ صوفی تھے۔ اس لحاظ سے انہیں بھی اس مثنوی کے مخالفین
ـی صف میں نظر آنا چاہیئے تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے وہ مثنوی مجھے خود پڑھائی اور اس انداز
ـے پڑھائی کہ علامہ اقبالؒ کے علم و فکر کی عظمت میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئی۔ اس کے بعد
ـب میں بسلسلۂ ملازمت لاہور آیا تو دادا جان نے تاکید کی کہ وہاں علامہ اقبالؒ کے ہاں حاضری دیتے

رہنما۔ علامہ سے اسی ذہنی تعلق اور قلبی پیوستگی کا نتیجہ تھا کہ قرآنِ مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریقہ سامنے آگیا۔ یعنی یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ:-

۱۔ قرآن کریم اپنے آپ کو نور (یعنی روشنی) کہتا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی خارجی ذریعہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو خود دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر شے کی اصل و حقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہے۔

۲۔ یہ عربی مبین کی کتاب ہے اس لئے اسے اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے جب معلوم ہو کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں اہلِ عرب ان الفاظ کا کیا مفہوم لیتے تھے جو قرآن میں آئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسے "محاورۂ عرب" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

۳۔ قرآن کسی موضوع کو تماماً اور کلیتہً ایک مقام پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اسے مختلف مقامات پر سامنے لاتا ہے اور ہر بار باندازِ نو ——— بنابریں اس کے کسی موضوع کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے وہ تمام مقامات سامنے ہوں جہاں اس نے اس سلسلہ میں کچھ کہا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آخر میں یہ کہ:

۴۔ قرآنی حقائق و معارف تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ علومِ حاضرہ نے جس حد تک ترقی کی ہے وہ انسان کی نگاہ کے سامنے ہوں۔

قرآن فہمی کا طریق

قرآن کریم کے سمجھنے کا یہ طریق تو سامنے آگیا لیکن اس کے لئے جس علمی اور تحقیقاتی مواد (MATERIAL) کی ضرورت تھی، وہ کہیں نہیں ملتا تھا۔ نہ تو قرآنِ مجید کا کوئی ایسا لغت موجود تھا جس میں اس کے الفاظ (مفردات) کا وہ مفہوم دیا گیا ہو جو زمانۂ نزولِ قرآن میں مروّج اور متبادر تھا۔ اور نہ ہی تبویب کی کوئی ایسی کتاب تھی جس میں قرآنی حقائق کو اس انداز سے (CLASSIFY) کر کے یکجا کیا گیا ہو کہ ہر موضوع سے متعلق جملہ مقامات بیک وقت سامنے آجائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیضانِ اقبالؒ سے قرآن کریم کے باندازِ نو سمجھنے کی جن درخشندہ آرزوؤں نے آنکھوں میں چمک اور دل میں کیف و نشاط پیدا کر دیا تھا ایک ایک کر کے افسردہ ہونے لگیں۔ یہ درماندگی اور مایوسی کس قدر کرب انگیز تھی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا! راستہ معلوم ہو لیکن سامانِ سفر پاس نہ ہو!!

اس پتنگے کی حقیقت کوئی ہم سے پوچھے شمع ہو سامنے پر طاقت پرواز نہ ہو

حضرتِ علامہؒ کے مشورہ سے میں نے اس زمانہ کے، ملک کے قریب قریب تمام علماء کرام کی خدمت میں اس قسم کا لغت اور تبویب مرتب کرنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے اس کی اہمیت کا تو اعتراف کیا لیکن اس سلسلہ میں عملاً کچھ کرنے کی کسی نے حامی نہ بھری۔ جب میں نے حضرت علامہؒ کو اس افسوسناک حقیقت سے مطلع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن فہمی کا شوق ہے تو یہ خارہ شگافی خود ہی کرنا ہو گی ——— تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش۔

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر

میں کبھی اس کوہِ گراں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنے تیشۂ کند کی ہیچ مقداری اور اپنے دست و بازو کی ناتوانی کو۔ اور اس کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ جاتا تھا کہ۔ ع

ذرّۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر!

میں، ایک عرصہ تک شدّتِ اشتیاق اور احساسِ بے بسی کی اس کشمکش میں وقفِ اضطراب رہا کہ نہ معلوم وہ کیا جذبہ تھا جس سے متاثر ہو کر میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ اس طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا تو شیوۂ وفا شعاری نہیں۔ تجربۃً ہی سہی، اس کی ابتدا تو کر کے دیکھو!

اور میں نے اس کوہ کنی کی ابتدا کر دی ـــــ بالکل بے ترتیبی سے۔ بغیر کسی پروگرام کے۔ یہ آج سے پچاس سال پہلے، ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ میں نے اس کی ابتدا تو اس طرح بے دلی سے کی، لیکن چند دنوں کے بعد یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں قدم اٹھاتا ہوں تو سامنے کے دروازے خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔ اور خدا کا یہ وعدہ، محسوس حقیقت بن کر وجہ فروغِ قلب و نظر ہو رہا ہے، کہ: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (۶۹/۲۹) ”جو ہمارے بارے میں جدّ و جہد کرتے ہیں، ہم خود ان کی راہنمائی صحیح راہوں کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں“۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے اس طریقِ جدید کی روشنی میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کئے جو اس زمانہ کے مشہور مجلّات ۔ مثلاً، دار المصنفین کے ماہنامہ معارف، اور دکن میں مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئے اور انہوں نے بڑی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس انداز سے ہمت افزائی کے سلسلہ میں ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

مولانا آزاد کی تفسیر

دنیائے علم و ادب، بلکہ جہانِ حقائقِ قرآنی میں (مولانا) ابو الکلام آزاد (مرحوم) کا نام بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا۔ ملک میں
ن کی تفسیر۔ ترجمان القرآن۔ کا غلغلہ پندرہ سولہ سال سے بلند ہو رہا تھا۔ ہمت شکن انتظار کے
۱۹۳۱-۳۲ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اربابِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سر آنکھوں
اٹھایا۔ ملک کی ممتاز ترین علمی شخصیتوں نے اس کی مدح و ستائش کے قصیدے کہے۔ نامور
ت میں اس پر فلک پیما تبصرے شائع ہوئے۔ میں نے جب قرآنِ خالص کی روشنی میں، اس پر
ڈالی تو اس کا نقطۂ ماسکہ یکسر اسلام کے خلاف نظر آیا۔ انہوں نے اس میں کہا تھا کہ ”عالمگیر
ئیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں“۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے اسلام
دیت اور افضلیت ختم ہو جاتی ہے اور یہ دیگر مذاہب کی سطح پر آ جاتا ہے۔ ہندوؤں کو اس قسم
ہمہ سماجی“ اسلام اس قدر خوش آیا کہ کانگرس نے اس کی تفسیر کا ہندی میں ترجمہ کرایا اور اس
شاعت کی۔ میں نے نامور اہلِ علم ہستیوں سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھ سے اتفاق تو
س پر تنقید کی جرأت کسی نے نہ کی۔ بالآخر میں نے خود اس پر بھرپور تنقید کی۔ اور میرا مقالہ

ماہنامہ معارف کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا، حالانکہ اس سے قبل، خود سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے قلم سے اس میں، اس تفسیر کی تعریف میں تبصرہ شائع ہو چکا تھا۔ میری اس تنقید نے ملک کے علمی حلقہ میں ہلچل مچا دی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ خود مولانائے مرحوم کے معتقدین کے حلقہ میں سے بعض اہلِ علم حضرات نے مولانا سے اس تنقید کا جواب لکھنے کا تقاضا کیا اور جب انہوں نے ان کا یہ تقاضا پورا نہ کیا تو وہ ان سے ایک گونہ برگشتہ ہو گئے۔ اس واقعہ سے میری ہمت اور بھی بڑھ گئی اور میں نے اپنی تحقیق کی رفتار تیز کر دی اور تبویب کا جو سلسلہ پہلے بے ترتیبی سے شروع کیا تھا اسے ایک ربط و ترتیب کے ساتھ منضبط کرنا شروع کر دیا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ۱۹۳۸ء تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ قائدِ اعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں لایا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو علماء، مذہب کے نام پر مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے، قرآن کریم کی روشنی میں ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اس مجلّہ نے تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔ وہ دور میری

طلوعِ اسلام

جنون آمیز سرگرمیوں کی شدت کا تھا۔ دفتر کی ملازمت۔ طلوعِ اسلام کا باقاعدگی سے اجراء۔ مخالفینِ تحریکِ پاکستان سے چومکھی لڑائی جس کی صفِ مقابل میں ملک کے مشہور ترین علماء شامل تھے۔ دہلی اور شملہ کے مختلف مراکز میں، قرآنی موضوعات پر تقاریر اور خطابات۔ نئی دہلی کی سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطباتِ جمعہ میں مسلم لیگ کے اجتماعات کے ساتھ، اقبال ڈے کے نام سے تحریکِ پاکستان کی تائید میں خطابات ——— اکثر ایسا ہوتا کہ شام چار بجے تک دفتر میں ہیں۔ رات کو میرٹھ، یا کرنال، یا حصار میں اجتماعات سے خطاب ہو رہا ہے اور دوسری صبح پھر دفتر میں موجود ہیں۔ میری ان دشت پیمائیوں میں جو صاحبِ جنوں میرے ہم سفر ہوتے تھے، ان میں سے ایک، میرے برادرِ بزرگ، محترم شیخ سراج الحق آج بھی میرے ہم نفس ہیں۔ اللہ ان کی عمر اور ہمت میں برکت عطا فرمائے کہ ان کے دم قدم سے، نام روشن ہے اک اُجڑے ہوئے میخانے کا۔ اس تمام تگ و تاز میں نہ صرف میری قرآنی تحقیق کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ بلکہ ایک مستقل سلسلۂ تصنیف کی ابتدا بھی ہو گئی۔ یعنی تصریفِ آیات کے طریق پر معارف القرآن کا سلسلہ۔ اس کی پہلی جلد ——— جو بڑی تقطیع کے سات سو صفحات پر مشتمل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور اہلِ ذوق نے اسے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی دوسری جلد مارچ ۱۹۴۵ء میں (جو قریب

سلسلۂ معارف القرآن

پان سو صفحات پر مشتمل تھی) اور تیسری جلد قریب ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل جولائی ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان جلدوں کا الگ الگ نام نہیں تھا۔ بعد میں انہیں الگ الگ عنوانات سے شائع کیا گیا۔ یعنی من و یزداں، جس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآنی تصریحات ہیں۔ ابلیس و آدم، جس میں انسان۔ آدم۔ ملائکہ۔ وحی۔ رسالت۔ وغیرہ موضوعات ہیں۔ جوئے نور، جس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرامؑ

تذکار جلیلہ ہے۔ برق طور میں ساز ضرب کلیم اور بنی اسرائیل کی داستان۔

چوتھی جلد کی تدوین کے وقت، ایک نہایت نازک اور مشکل مرحلہ سامنے آیا۔ ارشاد خداوندی ہے کہ: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۳۳/۲۱)۔ "تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔" ذہن میں خیال ابھرتا تھا کہ جس زندگی کو خدا قیامت تک کے لئے بہترین نمونہ قرار دیتا ہے، یہ کچھ بعید سا نظر آتا ہے کہ وہ اس زندگی کا نقشہ مرتب کرنے کا کام انسانوں پر چھوڑ دے۔ اسے، اس زندگی کا نقشہ خود مرتب کر کے قرآن کے آئینے میں محفوظ کر دینا چاہیئے تھا۔

معراج انسانیت

چنانچہ اس خیال کے تحت جب میں نے تصریف آیات کے انداز سے تحقیق شروع کی تو یہ دیکھ کر میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کہ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کے اصولی خط و خال سب قرآن کے اندر جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان خطوط کی بنیادوں پر کتاب سیرت مرتب کی اور وہ معراج انسانیت کے نام سے ۱۹۴۹ء میں اشاعت پذیر ہو گئی۔ بڑی تقطیع کے قریب ۹۰۰ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف اپنے انداز کی منفرد کتاب سیرت تھی جسے ارباب ذوق نے سر آنکھوں پر اٹھایا۔ میں اس توفیق ایزدی پر جس قدر سجدات تشکرانہ بھی ادا کروں کم ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں شعلہ مستور کے نام سے، حضرت عیسیٰؑ کے کوائف حیات شائع ہوئے اور یوں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکار جلیلہ کی داستان مکمل ہو گئی۔ یہ سلسلہ درحقیقت ان انقلابات کا تذکرہ ہے جو ان حضرات کے ہاتھوں مختلف اقوام و ملل میں برپا ہوتے رہے اور جو ظلمت کدۂ عالم میں ہمیشہ کے لئے ضیابار رہیں گے۔ اس دوران میں، اس سلسلہ سے ہٹ کر بھی کچھ کتابیں شائع ہوئیں۔ مثلاً سلیم کے نام خطوط کی تین جلدیں۔ طاہرہ کے نام خطوط۔ اسباب زوال امت۔ اسلامی معاشرت وغیرہ۔

میری ان حقیر سی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ قرآن مجید کا نام ایک کتاب زندہ کی صورت میں فضا میں گونجنے لگا اور قوم کے نوجوان طبقہ نے اس میں جاذبیت محسوس کرنا شروع کر دی۔ ان نوجوانوں کی طرف سے ایک سوال، بنیادی طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اور وہ یہ کہ جب خدا نے انسان کو عقل و شعور کی خصوصیت سے نوازا ہے تو زندگی کے مسائل اس کی رو سے کیوں نہیں حل ہو سکتے جو ماورائے عقل سرچشمۂ علم یعنی وحی کی ضرورت لاحق ہو؟ ان کا یہ سوال ایسا نہیں تھا جسے لاحول پڑھ کر ماتھے کی تیوری سے دھتکار دیا جاتا۔ اس کا اطمینان بخش جواب میرے ذمے تھا۔ میں نے انسانی زندگی کے مسائل کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا اور حکمائے یونان سے لے کر دور حاضرہ تک کے مفکرین، محققین، مؤرخین، علمائے سائنس اور علم النفس کے ماہرین وغیرہ نے اس اڑھائی ہزار سال کے عرصہ میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے خود انہی کے الفاظ میں، حسن ترتیب کے ساتھ یکجا کیا اور "انسان نے کیا سوچا؟" کے نام سے اسے اس کتاب کی شکل میں، ۱۹۵۵ء میں شائع کیا جس نے علم و شعور کی دنیا میں فکر کے نئے چراغ روشن کر دیئے۔ اس

انسان نے کیا سوچا؟

کتاب میں میں نے اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا- لیکن جب، ایک خدا کا منکر بھی اس کتاب کو ختم کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس نتیجہ پہ پہنچ جاتا ہے کہ زندگی کے مسائل کا حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے کسی ماورائے فکرِ انسان کا سرچشمۂ علم کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ یہ کتاب قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرآن کی طرف متوجہ کرنے میں بڑی ممد ومعاون ثابت ہوئی ہے۔

اسی دوران میں ہمارے ملک میں ہی نہیں، ساری دنیا میں معاشیات نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی اور قدیم نظامِ سرمایہ داری اور جدید نظامِ کمیونزم یا سوشلزم میں شدید کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ ہماری قدامت پرست مذہبی پیشوائیت، نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابقِ اسلام ثابت کرنے کی سعی ناکام میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہی تھی ——— یعنی اس اسلام کے مطابق ثابت کرنے میں جو ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ تھا- اس کا ردِّ عمل یہ تھا کہ ہمارا نوجوان طبقہ کشاں کشاں کمیونزم کی طرف بڑھے چلا جا رہا تھا- میں نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور نظامِ ربوبیت

نظامِ ربوبیت

نامی کتاب میں قرآنِ کریم کا معاشی نظام پیش کیا جس نے اس خطرہ کے سیلاب کو تھامنے کے لئے محکم بند کا کام دیا- اس اہم کتاب کا تازہ ایڈیشن زیرِ طباعت ہے۔

(۰)

میں نے اس دوران میں جو قرآنی فکر اور تعلیم پیش کی اس میں ایک چیز نمایاں تھی- اور وہ یہ کہ اس میں قرآنی آیات کا مفہوم بالعموم مروجہ ترجموں سے مختلف تھا- اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا- اس سے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ میرے پیش کردہ مفہوم کی سند کیا ہے؟ اس کی سند تھی محاورۂ عرب- یعنی قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم جو زمانۂ نزولِ قرآن میں لیا جاتا تھا- چنانچہ میری سالہا سال کی جگر کاویوں، دیدہ ریزیوں اور اختر شماریوں کا ماحصل، لغات القرآن

لغات القرآن

کی شکل میں ۱۹۶۰ء میں قوم کے سامنے آگیا- قریب انیس سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم لغت چار جلدوں میں شائع ہوا ہے- میں، فخریہ نہیں بطورِ تحدیثِ نعمت، نہایت منکسرانہ انداز سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس نہج کا قرآن کا لغت، اردو تو ایک طرف دنیا کی کسی زبان میں بھی موجود نہیں- اس نے اربابِ ذوق وتجسّس کے سامنے، فکرِ قرآن سے بہرہ یاب ہونے کی نئی راہیں کھول دی ہیں اور پاکستان اور بیرونِ پاکستان، اعیانِ تحقیق اس سے استفادہ کر رہے ہیں- فالحمد للہ علیٰ ذالک-

مفہوم القرآن

اسی دوران میں، میں اس لغت اور تبویب کی رو سے، قرآن مجید
مفہوم بھی مرتب کئے جا رہا تھا- چنانچہ الحمد سے والناس تک، پور
قرآن کریم کا مفہوم، تیس پاروں کی شکل میں مفہوم القرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ارباب
ذوق کی تشنگی کی تسکین بہم پہنچانے کی خدمت سرانجام دے رہا ہے- اس مفہوم نے اربابِ فکر ودا

کو قرآن مجید کے عام ترجموں اور تفسیروں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

لغات القرآن کی تدوین کے سلسلہ میں ایک چھوٹا سا واقعہ گوش گذار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک افیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآن مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدوّن کرنے کا کام ہوا ہو یا ہو رہا ہو، ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اسی سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کونسی ہے جس کے زیرِ اہتمام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی نہ جماعت۔ نہ کوئی مالی ذرائع تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیرلبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں! ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابلِ فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد، رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن بات کیا ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا کہ یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کرلے۔ سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تئیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے۔ (اس نے اُسے یہ بتا دیا تھا)

وہ عراقی عالم سچا تھا ——— وہ تو ایک طرف، اگر کوئی خود مجھ سے پوچھے کہ تم نے اس بے سروسانی کے عالم میں، یہ سب کچھ تن تنہا کس طرح کر لیا تو میں بھی اس کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکوں! اس کے متعلق اگر میں کچھ کہہ سکوں تو (اقبال کے الفاظ میں) فقط اتنا کہ: ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اور اس کے بعد عشق کی اس ندی کی روانیاں بدستور جاری رہیں۔ ۱۹۶۸ء میں میری انگریزی زبان میں پہلی تصنیف (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) شائع ہوئی جس نے پاکستان کے انگریزی دان طبقہ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اربابِ دانش و بینش کو اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس کرایا۔ اس سے قرآن کی مہرِ عالمتاب کی شعاعیں دور دور تک پھیل گئیں اور پھیلتی جا رہی ہیں۔ ۱۹۶۹ء

میں "جہانِ فردا" کے نام سے اُخروی زندگی کے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی جسے یوں کہیئے کہ وہ سلسلۂ معارف القرآن کی آخری کڑی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں "مذاہبِ عالم میں مبیّنہ آسمانی کتابیں" شائع ہوئی۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے سوا کوئی ایسی مبیّنہ آسمانی کتاب نہیں جسے غیر محرف کہا جا سکے۔ ۱۹۶۴ء میں ایک اور اہم کتاب ـــــ اسلام کیا ہے؟ ـــــ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں "کتاب التقدیر" شائع ہوئی جس نے تقدیر جیسے پیچ در پیچ مسئلہ کو اس حسن و خوبی سے حل کر کے رکھ دیا کہ جس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اس کا قلب مطمئن ہو گیا۔ اور ۱۹۷۳ء میں میری عمر بھر کی ایک آرزو کی تکمیل اس کتاب کی اشاعت سے ہوئی جس کا نام شاہکارِ رسالتؐ ہے اور جس میں اسلامی نظام کا وہ نقشہ سامنے آگیا ہے جس سے اس کی تکمیل عہدِ فاروقیؓ میں ہوئی تھی۔ معراجِ انسانیت کے ساتھ یہ کتاب بھی میرے لئے باعثِ ہزار سعادت ہے۔ محترم شورش کاشمیری (مرحوم) نے اس کتاب کا صرف ایک باب پڑھنے کے بعد اپنے اخبار چٹان (بابت ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء) میں لکھا تھا کہ:-

> اس عظیم کتاب کو پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز بارگاہِ رسالتؐ میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے اور یہ کتاب ان کیلئے توشۂ آخرت ہو گی۔ اللہ تعالےٰ انہیں ان فضلائے اُمت کے ساتھ جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔

اور اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا "پرویز افکارِ اسلامی کی کربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز ہیں۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتویٰ واپس لینا چاہیئے۔"

۱۹۷۴ء میں تحریکِ ختمِ نبوّت میں نیا ولولہ بیدار ہوا تو میری کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کا پس منظر معلومات افزا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں، بہاول نگر کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں تصفیہ طلب امر یہ تھا کہ احمدیوں کا شمار مسلمانوں میں کیا جا سکتا ہے یا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیرِ سماعت رہا اور مسلمانوں کی طرف سے جیّد علماء کرام نے اس کی پیروی کی لیکن بات کسی ٹھکانے نہ لگی۔ ۱۹۳۵ء میں وہاں کے ڈسٹرکٹ جج، محمد اکبر (مرحوم) نے اس کا فیصلہ صادر کیا جس میں لکھا تھا کہ نو سال تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ مقامِ نبوّت کیا ہے لیکن بات واضح نہ ہو سکی۔ اتفاقیہ ایک دن میں نے ایک رسالہ میں چودھری غلام احمد پرویز کا ایک مضمون پڑھا جس سے یہ سارا مسئلہ حل ہو گیا اور مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ احمدیوں کا شمار مسلمانوں میں نہیں کیا جا سکتا ـــــ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، یہ پہلا عدالتی فیصلہ تھا جس میں احمدیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا کہ "نبوّت کی جو حقیقت انہوں نے (پرویز صاحب نے) بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔" (ص ۱۰۷)۔

لیکن یہ فیصلہ اُس وقت قانونی حیثیت حاصل نہ کر سکا۔ ۱۹۷۴ء میں، میں نے انہی قرآنی شواہد پر مبنی یہ کتاب شائع کی۔ مقامِ تشکر ہے کہ پاکستان کی پارلیمان نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا اور میری سالہا سال کی محنت ثمر بار ہوئی۔

(۰)

میں سمجھتا تھا کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن شائع ہو جانے کے بعد میرے سر سے ذمہ داریوں کا بوجھ اُتر جائے گا لیکن میرا یہ احساس خوش فہمی پر مبنی ثابت ہوا۔ میری قرآنی فکر سے مستفید ہونے والے احباب نے تقاضا کیا کہ مفہوم کے بعد مجھے، محاورۂ عرب اور تصریف آیات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر بھی مرتب کرنی چاہیئے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری بھی مجھے قبول کرنی پڑی اور تفسیر قرآن کی پہلی جلد مطالب الفرقان کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۷۶ء میں۔ تیسری جلد زیر کتابت ہے اور چوتھی جلد زیر تسوید۔ یہ تفسیر قرآنی روشنی کے عام کرنے میں نمایاں خدمات سر انجام دے رہی ہے۔

اور آخر میں ایک اور حاصلِ عمر کا تذکرہ۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، میں نے تصریف آیات کے اصول کی بنیاد پر تبویب کا کام ۱۹۲۸ء میں شروع کر دیا تھا لیکن بے ترتیبی کے ساتھ۔ اس کے بعد، ۱۹۳۵ء سے اسے ربط و ترتیب کے ساتھ منضبط کرنا شروع کیا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اس بنیادی

تبویب القرآن

کاوش کے ماحصل کو بھی شائع کر دینا چاہیئے۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ یہ تکمیل تک پہنچ جائے تو اسے شائع کیا جائے۔ لیکن بعد میں میں نے خود محسوس کیا کہ قرآن تو بحر نا پیدا کنار ہے۔ اس کے متعلق حرفِ آخر شاید دنیا کے آخری انسان کے حصے میں آئے گا۔ لہٰذا میں احباب سے متفق ہو گیا کہ جتنا کچھ ہو چکا ہے اسے شائع کر دینا چاہیئے تاکہ یہ محفوظ بھی ہو جائے اور اس کی افادیت بھی عام ہو جائے۔ بنابریں سال گذشتہ انہی دنوں، تبویب القرآن تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر احباب کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور میں نے بارگاہ ربّ العزّت میں سجدۂ تشکرانہ ادا کیا۔ اس کے بعد قوانین قرآنی کا ایک جامع مجموعہ الگ بھی شائع کرایا۔

اس سلسلۂ تصنیف و تالیف کے ضمن میں میں نے ان متعدد کتابوں کا ذکر نہیں کیا جو میرے مضامین کے مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ نہ ہی ان تالیفات کا جو ادارہ کی طرف سے بے نام شائع ہوئی ہیں اور جو اکثر و بیشتر میری تحریروں پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں میں نے درسِ قرآن کے اس سلسلۂ دراز کا بھی ذکر نہیں کیا جو کراچی میں ۱۹۵۳ء سے باقاعدہ شروع ہوا اور پھر ۱۹۵۸ء سے لاہور میں ہفتہ وار جاری ہے۔ نہ ہی صد ہا مستفسرین کے استفسارات کے جوابات کا، جن کا ذریعہ خط و کتابت بھی ہے، اور ملاقاتیں بھی۔

یہ ہے عزیزانِ من! فکرِ قرآنی کی طلب و جستجو کی ان وادیوں کی خفیف سی جھلک جن سے میں گزشتہ پچاس سال میں گذر کر اس مقام پر پہنچا ہوں۔

(۰)

اس کے بعد میں اس سوال کی طرف آنا چاہتا ہوں جو آپ کے دل میں رہ رہ کر اُٹھ رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ ہی میں نے کوئی نیا فرقہ پیدا کیا ہے۔ نہ ہی میرا واسطہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی میں عملی سیاست میں حصہ لیتا ہوں۔ تو پھر میری اس قدر مخالفت کیوں ہوتی ہے؟ ——— اور مخالفت بھی ایسی شدید کہ شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں مذہب کا نام لیا جاتا ہو اور پرویز کو گالیاں نہ دی جاتی ہوں۔ یہ بات واقعی باعثِ حیرت ہے اور اس کی رمز کا سمجھ لینا ضروری۔

میری مخالفت کی وجہ

حضورؐ نبی اکرم کی اس قدر شدید مخالفت ہوتی تھی کہ بعض اوقات ان لوگوں کی ناشائستہ حرکات سے حضورؐ کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے۔ ایک مقام پر اللہ تعالےٰ نے یہ کہہ کر آپ کو تسلی دی کہ: قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۶/۳۳) "ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ تیرے خلاف جو کچھ کہتے ہیں تو اس سے دل گرفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تجھے جھوٹا نہیں کہتے۔ یہ آیاتِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں"۔ میں بلا تشبیہ اور بلا تمثیل عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ لوگ میری مخالفت نہیں کرتے۔ کتاب اللہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ بظاہر یہ چیز عجیب سی دکھائی دے گی، لیکن ہے یہ حقیقت۔ آپ، حضرات انبیاء کرامؑ ——— یعنی حضرت نوحؑ سے لے کر حضور خاتم النبیینؐ تک ——— کی ان داستانوں کو دیکھئے جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جب اور جہاں بھی کسی نبی نے خدا کی وحی پیش کی اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ یہ مخالفت اس شخص کی نہیں ہوتی تھی جو خدا کی وحی پیش کرتا تھا، یہ مخالفت اس وحی کی ہوتی تھی جسے وہ پیش کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ یہ اس لئے کہ خدا کی وحی (کتاب) ہر اس نظام کو مٹانے کے لئے آتی تھی جو انسانوں کا وضع کردہ ہوتا تھا اور اس کی جگہ خدا کے متعین کردہ نظام کو مسلّط کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ انسانوں کے وضع کردہ نظام کے ساتھ خاص گروہوں کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ ان گروہوں کو تین متمیز شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) اربابِ حکومت، جو اپنی مرضی کے مطابق قوانین بناتے اور احکام صادر کرتے ہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے سیکولر نظام کہا جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ (۲) سرمایہ دار طبقہ، جو دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتا ہے اور (۳) مذہبی پیشوائیت، جو عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے کہ اربابِ حکومت، یا سرمایہ پرست جو کچھ کرتے ہیں، وہ خدا کی شریعت کے عین مطابق ہے، لہٰذا ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانا، یا لب کشائی کرنا، خدا کے غضب کو مول لینا ہے۔ کتابِ خداوندی کی مخالفت میں اربابِ حکومت یا سرمایہ دار طبقہ براہِ راست سامنے نہیں آتا۔ وہ پیچھے رہتے ہیں اور اربابِ شریعت آگے آتے ہیں۔ فرعون، حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے خود سامنے نہیں آیا تھا۔ اس نے ہامان کو آگے کیا تھا۔ ان لوگوں کے پاس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ایک ہی حربہ ہوتا ہے۔ وہ ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ شخص (یعنی انقلابِ خداوندی کا داعی) تمہیں تمہارے اسلاف کے عقائد اور مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ تم اٹھو اور اسے ملک بدر کر دو، آگ میں جھونک دو، پھانسی کے تختے پر لٹکا دو۔ سورۂ بقرہ

ہیں ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا
عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰) "جب
ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کا اتباع کرو تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے اسلاف
کی روش پر ہی چلتے جائیں گے۔ وہ کبھی اس کے پرکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھیں گے کہ ان کے اسلاف کی یہ روش
عقل و فکر اور ہدایتِ خداوندی کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔" قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ انداز کسی خاص قوم
کا نہیں۔ دنیا میں جب اور جہاں بھی پیغامِ خداوندی کو پیش کیا گیا وہاں کے مفاد پرستوں نے یہ کہہ کر
اُسے رد کر دیا کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳)
"ہم نے اپنے اسلاف کو ایک مسلک پہ چلتے پایا ہے، ہم انہی کا اتباع کئے جائیں گے۔" یہ ہے وہ
کش مکش جسے قرآنِ کریم نے ہر رسول کے ضمن میں مسلسل بیان کیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں یہ
کش مکش اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔ محمد رسول اللہ والذینؓ معہ کے مقدس ہاتھوں جو
جو نظامِ خداوندی متمکن ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد وہ باقی نہ رہا (کن وجوہات کی بنا پر ایسا ہوا تھا اس کے
متعلق میں متعدد مقامات پر تفصیل سے بتا چکا ہوں) اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ نظاموں نے
لے لی ——— ملوکیت کا سیکولر نظام - سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت۔ حضورؐ کے بعد انبیاءؑ کا
سلسلہ ختم ہو چکا تھا اس لئے انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کو مٹا کر ان کی جگہ نظامِ خداوندی کے قیام
کے لئے کسی نبی نے نہیں آنا تھا۔ البتہ جو کتاب حضورؐ پر نازل ہوئی تھی اسے قیامت تک کیلئے محفوظ کر
دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کے بعد اس کتاب کے مطابق نظام قائم کرنے کی دعوت غیر از نبی، اُمت
محمدیہ کے افراد کی طرف سے دی جائے گی۔ آپؐ سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی نبی اپنے ملک سے ہجرت
کر جاتا تو اس کے مخالفین اس کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ لیکن حضورؐ کی دعوتِ انقلاب کے مخالفین، یعنی قریش
نے جماعتِ مؤمنین کی ہجرت کے بعد، نہ صرف یہ کہ ان کا پیچھا نہ چھوڑا بلکہ ان کی مخالفت میں اور شدت

نظامِ خداوندی کی مخالفت

پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جس نظام کی
طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے، وہ اگر کسی خطۂ زمین میں بھی
متمکن ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج کے اثرات دُور دُور تک پھیل جائیں گے اور ان کے سامنے
ان کا نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ یہ نظام کسی جگہ بھی متمکن نہ ہونے
پائے۔ ہمارے دَور میں کتاب اللہ کے مطابق نظام مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی قائم نہ تھا۔ علامہ اقبالؒ
نے سوچا کہ ایسے نظام کا قیام کسی ایسے خطۂ زمین ہی میں ممکن ہے جہاں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔
[...]س کے لئے انہوں نے ایک جدید خطۂ زمین کے حصول کا تصوّر دیا۔ اور قائدِ اعظمؒ نے اس کے حصول
[...]ے لئے عملی کوشش کی۔ اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت مسلمانوں
[...]ے اربابِ شریعت کی طرف سے خاص طور پر کیوں ہوئی تھی۔ انگریز اور ہندو، دونوں تقسیمِ ہند کے
[...]الف ضرور تھے لیکن وہ مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کے قیام کے مخالف نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر

مسلمان اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا دعویٰ ترک کر دیں تو ہم تقسیم ملک کی مخالفت نہیں کریں گے۔ وہ تو اتنا کہہ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے لیکن مسلمانوں کے اربابِ مذہب اس کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ وہی کتاب اللہ کی مخالفت تھی جو حضرت نوحؑ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد نہ یہاں علامہ اقبالؒ موجود تھے، اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ زیادہ دنوں تک زندہ رہے۔ میں نے تحریکِ پاکستان میں اس لئے حصہ لیا تھا کہ اس مملکت کو کتاب اللہ کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کیا جا رہا تھا۔ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی عدم موجودگی میں، میں نے اپنا فریضہ سمجھا کہ

میرا فریضہ

اپنی اس پکار کو جاری رکھوں کہ یہاں نظامِ مملکت، کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق متشکل ہونا چاہیئے۔ میری اس دعوت کی مخالفت ہونی لازمی تھی۔ اس مخالفت کے پیچھے تو اربابِ اقتدار اور سرمایہ پرست طبقہ تھا لیکن تاریخ کی سنتِ جاریہ کے مطابق اس میں پیش پیش مذہبی پیشوائیت ہی تھی۔ اس سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ مخالفت میری نہیں۔ یہ اس نظام کی مخالفت ہے جسے کتاب اللہ کے مطابق قائم کرنے کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔

اس مقام پر میں قریش کے اس خطرے کی طرف دوبارہ توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کی رو سے انہوں نے سمجھا تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک علاقہ میں بھی بار آور ہو گیا تو اس کے نتائج بڑے دور رس ہوں گے۔ قریش کے زمانے میں تو پھر بھی سلسلۂ رسل و رسائل عام نہیں تھا، آج سارا کرۂ ارض یوں کہیئے کہ ایک مربوط علاقہ بن گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی ایک گوشے کی تحریک کے اثرات زلزلہ کے جھٹکے کی طرح سارے کرۂ ارض کو متاثر کر دیتے ہیں۔ لہٰذا، آج دنیا بھر کی قومیں اس سے خائف ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہ ہو جائے۔ لہٰذا کتاب اللہ کی طرف دعوت کی مخالفت میں دنیا کی تمام قومیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوتی ہیں۔ ان کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ یہاں قرآنی نظام نافذ نہ ہونے پائے۔

پاکستان کے اربابِ مذہب کی طرف سے میری قرآنی دعوت کی مخالفت کا مجھے نہ افسوس ہے نہ رنج، اس لئے کہ یہ مخالفت غیر متوقع نہیں۔ لیکن مجھے افسوس اس کا ہے کہ اس مخالفت میں یہ حضرات دیدہ و دانستہ بددیانتی اور جھوٹے پروپیگنڈے سے کام لے رہے ہیں۔ آپ ہر محراب و منبر سے یہ آواز

جھوٹا پراپیگنڈہ

سنیں گے کہ پرویز تین نمازوں اور نوروزوں کا پرچار کرتا ہے میں نماز پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس نے ایک نیا فرقہ آگے چل کر یہ نبوت کا دعویٰ کرے گا وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب جھوٹا پراپیگنڈہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہتا بلکہ جو کہتے یا کرتے ہیں میں ان کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔ ان حضرات کے اس جھوٹے پراپیگنڈے ہے کہ قرآن کی آواز ابھرنے نہ پائے۔ چونکہ اس پراپیگنڈہ کے پیچھے دولت کے انبار ہیں اور کونسی قوتیں اس کی پشت پر ہیں، اس لئے اس نے فضا کو وبائی امراض کے جراثیم کی طرح

کر رکھا ہے کہ آپ کسی کے سامنے پرویز کا نام لیجئے وہ جھٹ سے کہہ دے گا کہ ہاں، ہاں! وہی پرویز جس نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ جو تین نمازوں اور نوروزوں کا فتنہ برپا کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا پرویز کا محض نام سننے سے یہ ردِعمل ہو وہ پرویز کے پیش کردہ قرآنی نظام کی بات سننے کے لئے کب تیار ہوگا؟

لیکن میں اس سے دل برداشتہ نہیں ہوں۔ خدا کا دعویٰ ہے کہ اس "الدّین" یعنی قرآنی نظام کو آخرالامر انسانوں کے تمام خود ساختہ نظاموں پر غالب آکر رہنا ہے۔ اور قرآن کریم کو اسی مقصد کیلئے ابدی طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ خدا نے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی قوم اس کتاب سے اعراض برتے گی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کتاب اپنے مشن میں ناکام رہ جائے گی۔ کوئی دوسری قوم اس کی علمبردار بن جائے گی۔ اگر وقت ہوتا تو میں بتاتا کہ اقوامِ عالم اپنے خود ساختہ نظاموں کے پیدا کردہ جہنم سے تنگ آکر کس طرح غیر شعوری طور پر اس نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جسے قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔ (میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں) میں اس وقت صرف آپ کے سامنے ایک ایسی مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ دنیا کے وہ دانشور جن کے ذہن کو مذہب نے مفلوج نہیں کر دیا کس طرح قرآنی حقائق کو اس انداز سے از خود سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور جس پر عمل پیرا ہو کر میں نے ان حقائق کو بے نقاب دیکھا ہے ——— یعنی محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کے مطابق۔

ایک غیر مسلم سائنسدان کی تحقیق

فرانس کا ایک مشہور سائنس دان ہے، جس کا نام ہے، (MAURICE BUCAILLE) وہ ایک ممتاز سرجن ہے۔ حال ہی میں اس کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ (THE BIBLE QURAN AND SCIENCE) یہ کتاب ابھی پاکستان میں نہیں پہنچی۔ میں نے براہِ راست انگلینڈ سے منگوائی ہے[1] یہ اپنے انداز کی ایک منفرد کتاب ہے اور میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل اور نوعِ انسان کے لئے خوشگوار امیدوں کی طائر پیش رس۔ اس نے لکھا ہے کہ میں نے اس نگاہ سے بائیبل کا گہرا مطالعہ کیا کہ اس میں مظاہرِ فطرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سائنس کے انکشافات کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، یہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس میں جو کچھ اس باب میں کہا گیا ہے جہالت اور توہم پرستی پر مبنی ہے۔ اس سے لامحالہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر (جیسا کہ ہم سے منوایا جاتا ہے) یہ خدا کی کتاب ہے تو پھر وہ خدا (معاذ اللہ) بڑا ہی جاہل ہے اور اگر خدا علیم و بصیر ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہو سکتی۔ زمانۂ قبل از تہذیب کے انسانوں کی پریشاں خیالیوں کا مجموعہ کہلا سکتی ہے۔

---

[1] کتاب کے پبلشرز ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ میں نے سوچا کہ یہودیت اور عیسائیت کے بعد دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب اسلام بھی ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ جس کتاب کو اس مذہب کے پیرو منزل من اللہ کہتے ہیں اس باب میں اس کی کیا کیفیت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں اسلام کا معتقد نہیں، میں نے ایک سائنسدان کی حیثیت سے خالصتہً علمی نقطۂ نگاہ سے اس کتاب کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا اور وہ بھی علوم سائنس کی حد تک۔ سائنس میں بھی میں نے ان مسائل کو نہیں لیا جو ہنوز نظریات میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف ان انکشافات کو لیا جو حقائق (FACTS) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اس نے کہا ہے کہ، میں عربی زبان نہیں جانتا تھا اس لئے لامحالہ مجھے قرآن کے تراجم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جہاں تک اہم حقائق کا تعلق ہے کوئی ایک ترجمہ دوسرے سے نہیں ملتا اور جہاں تک سائنس کے انکشافات کا تعلق ہے، تفاسیر بیشتر رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر ریسرچ کا شوق ہے تو پھر اس کتاب کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ عربی سیکھی جائے اور عربی بھی جدید نہیں بلکہ وہ قدیم عربی جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، عزیزانِ من! آپ سوچیئے کہ اس شخص کی نگاہ کتنی دور تک پہنچی اور اس نے کس طرح اس حقیقت کو پالیا کہ قرآن مجید محاورۂ عرب کی رو ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ عربی سیکھنے کیلئے خود عرب پہنچا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں اس کی شاہ فیصل (مرحوم) سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

عربی زبان پر اس قدر دسترس حاصل کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ اسے اس کا بھی اطمینان حاصل کرنا چاہیئے کہ جو کتاب آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی امت کو دیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب کا ایک پورا باب اس تحقیق کی نظر کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ کتاب بالکل غیر محرف ہے اور بلا شائبہ تشکیک اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود۔ اس تحقیق کے دوران وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ یہ خدا کی کتاب ہے اس لئے نہ اس کتاب کو محمدؐ کی کتاب کہنا چاہیئے، نہ اسلام کو محمدؐ کا دین۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی جو انہوں نے مسلمانوں کو

محمدؐ ازم

(MOHAMMADAN) اور اسلام کو (MOHAMMADANISM) کہنا شروع کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ خود مسلمان بھی اس فریب میں آ گئے۔ محمدؐ نے کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام ان کا وضع کردہ دین ہے۔

اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ میں نے سائنس کے ان ثابت شدہ حقائق کو لیا جن کا تعلق تخلیق کائنات، فلکیات، ارضیات، نباتیات، حیاتیات اور خود انسانی تخلیق اور جنین کی پیدائش سے ہے، اور ان موضوعات کے متعلق قرآن کی ورق گردانی شروع کی۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کا یہ انداز نہیں کہ وہ ایک موضوع پر ایک ہی مقام پر سب کچھ کہہ دے۔ وہ اس کے متعلق مختلف مقامات پر بیان

کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوا کہ میرے پیش نظر موضوعات کے متعلق قرآن میں جہاں جہاں کچھ آیا ہے اسے الگ مدوّن کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح اس نے قرآن کے ان حصوں کی تبویب کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ محاورۂ عرب کے بعد یہ وہ دوسرا بنیادی طریق ہے جسے قرآن کریم نے قرآن فہمی کے لئے خود تجویز کیا ہے اور جس پر میں پچاس سال سے کاربند چلا آ رہا ہوں۔ یہ ریسرچ سکالر آج تک مجھ سے نہیں ملا، اور جہاں تک میرا خیال ہے، میری کوئی کتاب بھی اس کی نظر سے نہیں گذری ہوگی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے قرآن فہمی کا یہ انداز مجھ سے مستعار لیا ہے۔ یہ انداز خود قرآن نے تجویز کیا ہے اور جو شخص بھی آزادانہ قرآن پر غور کرے گا اس کے سامنے یہ طریق خود بخود آجائے گا۔

اس کوہ کنی کے بعد وہ قرآنی سرچشمہ سے جوئے شیر لانے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی کسی ایک ثابت شدہ حقیقت کو لے کر اس سے متعلقہ آیات کو سامنے رکھتا ہے اور پھر آیت کے الفاظ کے معانی بنیادی عربی زبان کی رو سے متعین کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ان معانی کی رو سے قرآن میں پیش کردہ حقیقت کس طرح سائنس کے انکشافات کے عین مطابق ہے۔ وہ ایسے مقامات پر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قدیم مفسرین تو معذور تھے کہ وہ قرآن کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے کیونکہ ان کے زمانے میں علم انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، لیکن مجھے افسوس آتا ہے دورِ جدید کے مترجمین اور مفسرین پر کہ وہ بھی آنکھیں بند کئے اسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ وہ موجودہ دور کے تراجم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:-

> ان تراجم میں اس قسم کی فاش غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ قدیم زمانہ کے مفسّرین نے جو کچھ کہہ دیا یہ لوگ بلا تحقیق اسی کو سند تسلیم کئے چلے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق تو یہ عذر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک لفظ کے متعدد مفاہیم میں سے، اُس خاص مفہوم کا انتخاب نہیں کر سکتے تھے جو قرآن میں بیان کردہ سائنٹیفک حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات نے اس مسئلے کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ انسانی علوم کی روشنی میں ان تراجم اور تفاسیر پر نظرِ ثانی کی جائے۔
> (ص ۱۱۸)

وہ ایک ایک آیت کو لیتا ہے۔ اس طریق سے اس کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ اس کے بعد بتاتا ہے کہ سائنس کے جدید ترین انکشافات کس طرح اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں اور اس کے بعد وجد و کیف کے عالم میں جھوم کر کہتا ہے کہ اے دنیا کے دانشورو! خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی فکر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی حقیقت بیان کر سکتا؟ ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس زمانے میں کوئی انسان یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا نہ کہہ سکتا۔ اس حقیقت کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے کہ اس علم کا سرچشمہ ماوراء عقلِ انسانی ہے۔ وہ ایک

مقام پر بائیبل اور قرآن کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

ان موضوعات کے متعلق جہاں بائیبل میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، قرآن میں مجھے اس قسم کی کوئی ایک غلطی بھی نہیں ملی۔ ایسے مقامات پر کھڑے ہو کر مجھے سوچنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنّف کوئی انسان تھا تو اس کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ سائنس کے ان حقائق کو ساتویں صدی عیسوی میں پیش کر سکتا جن کا انکشاف اس دور میں آکر ہوا ہے۔ جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلاشک و شبہ وہی ہے جسے پیغمبر اسلام نے دنیا کو دیا تھا، لہٰذا اس میں بعد کے کسی ردّوبدل، اضافہ یا آمیزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا عقلِ انسانی اس کی کوئی توجیہ پیش کر سکتی ہے کہ اس زمانے میں ایک انسان نے یہ کچھ کیسے معلوم کر لیا؟ میں تو اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ (ص ۱۲۰)

اس سے ذرا آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:۔

جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے وہ لامحالہ انسان کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک انسان، متنوع حقائقِ کائنات کے متعلق جو اس زمانے میں انسانوں کے سامنے آئے ہی نہیں تھے ایسی باتیں کہہ دے جو چودہ سو سال کے بعد کہیں جا کر بے نقاب ہوئی ہوں۔ بنا بریں میں تو قرآن کے متعلق یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہو سکتا ہے۔ (ص ۱۲۵)

ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ:۔

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے زمانے سے آگے تھیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں رطب و یابس کا ملغوبہ ہے۔ جہاں ایک بات صحیح ملتی ہے تو ننانوے باتیں اُس دَور کی اوہام پرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کی یہ حالت نہیں۔ اس میں بے شمار ایسے حقائق کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق عصرِ حاضر کے علوم سے ہے لیکن ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی تردید دورِ حاضرہ کے سائنٹیفک انکشافات نے کی ہو۔ یہ ہے فرق، انسانی مفکّرین کی دور نگہی اور قرآن کے تبیان حقیقت میں! (ص ۱۶۳)

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا نابغہ کیوں نہ ہو۔ میرے سینے میں رہ رہ کر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ میں چند آیات کے متعلق اس محقق کے پیش کردہ مفہوم کی کچھ مثالیں پیش کروں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ وقت کی قلّت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ قرآن کریم میں اجرامِ فلکی کے متعلق کہا گیا ہے کہ: كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱/۳۳) شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس کا ترجمہ کرتے ہیں "سب اپنے اپنے گھر میں پھرتے ہیں"۔ باقی

تراجم بھی قریب قریب اسی نہج پر ہیں۔ یہ سکالر کہتا ہے کہ یہ تراجم قرآن میں بیان کردہ حقیقت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے اور اسی لئے علم الافلاک کے ماہرین اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ زمانۂ نزولِ قرآن کی عربی زبان کی رو سے لفظ فلک کے معنیٰ "گھر" نہیں۔ بلکہ وہ گول دائرہ ہے جس میں کوئی متحرک شے پھرتی ہو۔ آج کی اصطلاح اس کا صحیح ترجمہ (ORBIT) یا مدار ہوگا۔ دوسرا لفظ ہے۔ "یَسْبَحُوْنَ" اس کا مفہوم گھومنا پھرنا نہیں۔ عرب اسے، پانی میں تیرنے والے اور خشکی پر دوڑنے والے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ اجرامِ فلکی خشکی پر نہیں دوڑتے، خلا میں متحرک رہتے ہیں اس لئے ان کے لئے "تیرنے" کا لفظ زیادہ قریب الفہم ہے۔ لیکن اس میں ایک اور بڑا لطیف اور نہایت اہم نکتہ بھی پوشیدہ ہے۔ پانی پر تیرنے والی مچھلی ہو یا خشکی پر دوڑنے والا گھوڑا، انہیں کوئی خارجی قوت متحرک نہیں رکھتی۔ وہ اپنے زورِ دروں سے متحرک رہتے ہیں۔ لہٰذا سَبْحٌ کے معنیٰ ہوئے "اپنی اندرونی قوت سے متحرک رہنا"۔ اس اعتبار سے قرآنی آیت کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۲۱/۳۳) کا مفہوم یہ ہے کہ "تمام آسمانی کُرّے اپنے اپنے مدار میں خود اپنے زور دروں سے مصروفِ گردش ہیں"۔ اس مفہوم کے بیان کرنے کے بعد وہ دنیا کے دانشوروں سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا اُس زمانے میں جب فیثا غورث جیسے مفکر کا یہ نظریہ مبنی برحقیقت سمجھا جاتا تھا کہ سورج ساکن ہے اور کائنات کا مرکز، کیا کوئی انسان وہ بات کہہ سکتا تھا جسے قرآن نے ان چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے؟ اس قسم کے دلائل و شواہد کے بعد وہ بار بار اعلان کرتا ہے کہ قرآن کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔

میں نے اس کتاب کا تعارف اس تفصیل کے ساتھ یہ کہنے کے لئے کرایا ہے کہ ہمیں اپنے ہاں کے حالات کو دیکھ کر، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، اقوامِ عالم اپنے نظامِ معاشرہ سے تنگ آ کر ایک نئے نظام کی تلاش میں ہیں اور وہاں کے دانشوروں کا ذہن قرآن مجید کو اس کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس کی ابتداء اس کے حقائق کو سمجھنے سے کی ہے۔ جب وہ آگے بڑھ کر اس کے نظام کی طرف آئیں گے تو اُسے بھی بے نقاب دیکھ لیں گے اور بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ وہی نظام ہے جس کی تلاش میں ہم حیران و سرگرداں پھر رہے تھے۔ دنیا کی مثالی فلاحی مملکت (WELFARE STATE) سویڈن کی ہے۔ وہاں کے ممتاز ماہر معاشیات (GUNNER MYRDAL) نے، فلاحی مملکت کے نتائج سے مایوس ہو کر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (BEYOND THE WELFARE STATE) اس میں وہ ایک ایسے نظام کا تصوّر پیش کرتا ہے جس میں انسان کو فی الواقعہ فلاح اور بہبود حاصل ہو جائے۔ اس کی تفصیل دینے کے بعد وہ لکھتا ہے:

تصوّراتی نظام

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرّۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی ممالک کی

لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے۔ رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصوّر محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

یہ دنیا انہیں قرآن کریم کے پیش کردہ نظام میں ملے گی۔ اس کا امکان انہی قوموں میں زیادہ روشن نظر آتا ہے اس لئے کہ وہ قدامت پرستانہ مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہیں یا آزاد ہو رہی ہیں۔ میں قرآن کریم کی اس حقیقت کو ایک عرصہ سے پیش کئے چلا آ رہا ہوں، اور اب، اسے پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ خدا کا نظام جو اس کی کتاب میں محفوظ ہے اسی قوم کے ہاں رائج ہو سکے گا جو مذہبی پیشوائیت کے زیر اثر نہ ہو۔ مذہبی پیشوائیت نے نہ کبھی پہلے کتاب اللہ کے مطابق نظام قائم ہونے دیا ہے نہ اب قائم ہونے دے گی۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ قرآنی نظام میں نظامِ سرمایہ داری کی طرح مذہبی پیشوائیت کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ سو ظاہر ہے کہ جس نظام میں خود ان کا وجود باقی نہ رہے، وہ اسے کس طرح نافذ ہونے دیں گے۔

قرآن کے راستے میں روک

قرآن مجید نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ..... (۹/۳۴) "اے جماعتِ مؤمنین! اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے ہیں۔ وہ اسی صورت میں ایسا کر سکتے ہیں کہ ملک میں نظامِ خداوندی نافذ نہ ہو۔ اس لئے یہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہتے ہیں۔" مملکتِ پاکستان اس لئے حاصل کی گئی تھی کہ اس میں قرآنی نظام نافذ کیا جا سکے۔ آپ اس مملکت کی تیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کس طرح اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہیں۔ آج کل اس مملکت کو اسلامی بنانے کے نعرے بڑے زور شور سے بلند کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اقامتِ دین۔ اسلامی نظام۔ نظامِ شریعت۔ نظامِ مصطفٰے۔ قوانینِ شریعت وغیرہ اصطلاحات ہر گلی کوچے میں سننے میں آئیں گی لیکن قرآنی نظام کے الفاظ آپ کو کہیں سنائی نہیں دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قرآنی نظام کہا جائے گا تو اس میں کسی غیر قرآنی نظریہ یا مسلک کی گنجائش نہیں ہو گی۔ اس کے برعکس جب اسلامی نظام یا نظامِ شریعت وغیرہ کہا جائے گا تو اس میں وضعی روایات کی رو سے نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت جیسے خلافِ اسلام مسالک عین مطابقِ اسلام قرار دیئے جائیں گے ——— "اسلام میں بے حد و نہایت ذاتی ملکیت" کے جواز،

اور "علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کے مماثل" قرار دینے کی سند، وضعی روایات کی رو ہی سے مل سکتی ہے۔ قرآن سے نہیں۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ مذکورہ صدر فرانسیسی محقق (BUCAILLE) کی نگہ ژرف بین نے اس حقیقت کو بھی پالیا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب کے آخری باب کو قرآن۔ بائبل اور ہماری روایات کے تقابل کے لئے مختص کیا ہے اور کہا ہے کہ وضعی روایات اور بائبل ایک ہی سطح پر ہیں۔

بہرحال، میں کہ یہ رہا تھا کہ جہاں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہوگا وہاں قرآنی نظام بار نہیں پا سکے گا۔ ہمارے ہاں اس نظریہ پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں دین خود سیاست ہے، اس لئے اس میں ان کے الگ الگ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ حضرات اس سلوگن کو عام کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔ اسلام میں اس نظریہ کا مطلب یہ تھا کہ فیصلے کتاب اللہ کے ہوں گے اور حکومت ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ اس لئے سیاست دین سے الگ نہیں ہوگی۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ فیصلے ان حضرات کے ہوں گے اور حکومت ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ یہ وہ مقیاکریسی ہے جسے ختم کرنے کے لئے قرآن نازل ہوا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں"۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ان کے فیصلوں کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں۔ قرآنی نظام میں حکومت خدا کی ہوتی ہے۔ ان کے نظامِ شریعت میں مذہبی پیشوائیت کی۔

دین و سیاست

ان حضرات کی کافر سازی کی داستان بڑی طویل ہے، قلّتِ وقت جس کی اجازت نہیں دیتی۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت پاکستان میں جتنے فرقے ہیں ان میں سے ہر ایک فرقہ، ہر دوسرے فرقوں کی طرف سے کفر کے فتوے لگ چکے ہیں اس لئے ان فتووں کی رو سے پاکستان میں کوئی بھی مسلمان نہیں۔ اور اس کے باوجود ان فرقوں کے نمائندے نظام مصطفےٰ قائم کرنے کے مدعی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس وقت ان میں نمایاں مفتی محمود اور مودودی صاحب ہیں۔ ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے۔ مفتی صاحب نے حیدرآباد پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> مودودی نے جمیعت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے..... میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ۔ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس کے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔ وہ امریکہ اور سرمایہ داروں

کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔

(ہفت روزہ زندگی لاہور۔ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

اب وہی مفتی صاحب، مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے ساتھ مل کر نظام مصطفےٰ قائم کرنے کا دعویٰ فرما رہے ہیں! حالانکہ انہوں نے کہا یہ تھا کہ مودودی صاحب بھی کافر ہیں اور ان کی جماعت سے تعلق رکھنے والا بھی کافر۔

ان سے آگے بڑھئے تو مفتی صاحب اور نورانی صاحب ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور نورانی صاحب حرمین الشریفین کے اماموں کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے۔ اور یہ سب نظام مصطفےٰ قائم کرنے کے مدعی ہیں! میرا جرم یہ ہے کہ میں انکے یہ عقائد اور مسالک قوم کے سامنے لاتا رہتا ہوں۔ یہی میری مخالفت کی وجہ ہے۔

(۰)

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جب صورتِ حالات یہ ہے کہ پاکستان میں قرآنی نظام کے قیام کے امکانات پہلے سے بھی زیادہ بعید ہو گئے ہیں، تو تم نے اپنی عمر بھر کی کاوشوں سے حاصل کیا کیا؟

میری ذمہ داری

ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ اس خطۂ زمین کو قرآنی نظام کی آماجگاہ بننے کیلئے حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے یہ اپنا فریضہ سمجھا کہ قوم کو بتاؤں کہ قرآنی نظام کیا ہے اور اسے یہاں کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔ میرا فریضہ اس حقیقت کو عام کرنا تھا۔ میری یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ میں اس نظام کو قائم کر کے رہوں۔ یہ ذمہ داری تو خدا نے حضورؐ نبی اکرم پر بھی عائد نہیں کی تھی کہ وہ اس نظام کو اپنی زندگی میں قائم کر کے رہیں۔ ایک دفعہ حضورؐ کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ کیا یہ نظام میری آنکھوں کے سامنے متشکل ہو جائے گا یا میری ساری عمر اسی تگ و تاز میں بسر ہو جائے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) ایسا آپ کی زندگی میں ہو گا یا آپ کے بعد آپ کو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ کا فریضہ اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ایسا ہو گا کب؟ سو جب اس نظام کا اپنی زندگی میں قائم کرنا حضورؐ کی بھی ذمہ داری نہیں تھی تو حضورؐ کے اس خاکِ پا کی کیا حیثیت ہے؟ میرا فریضہ اپنی بساط کے مطابق اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ نتیجہ خیز کب ہو گا، اس کی (WORRY) کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ یہ ہے میری سعی و کاوش کی کیفیت۔ اور یہ تھا میرا فریضہ جسے میں ادا کئے چلا آ رہا ہوں ؎

وفا خطا تھی! خطا میں نے زندگی بھر کی اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآنی نظام کسی خاص قوم یا خاص خطۂ زمین کا پابند نہیں۔ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ یہ مہرِ عالمتاب ہے۔ جو قوم بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھے گی اس کی روشنی سے مستنیر ہو جائے گی۔ اس کتاب کے بھیجنے والے نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ: لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ۔ (۲۴/۳۵) اس میں مشرق اور مغرب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر — فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

کوئی اور قوم!

اللہ تعالےٰ نے تو قرآن کی سب سے پہلی مخاطب قوم سے کہہ دیا تھا کہ: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔ (۴۷/۳۸)۔ اگر تم نے اس قرآن سے اعراض برتا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ مسلم اقوام کے قرآن سے اس اعراض کو دیکھ کر، علامہ اقبالؒ نے انتہائی درد اور گداز سے کہا تھا کہ: ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از اُمّتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی!
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست — احتیاجِ روم و شام اورا کجاست
حق اگر از پیشِ ما بردارد رخش — پیشِ قومے دیگرے بگذارد رخش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند — آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ)

علامہ اقبالؒ نے ان احساسات کا اظہار آج سے قریب پچاس سال پہلے کیا تھا اور اس سے ان کی جانِ حزیں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے اور ہماری موجودہ حالت کو دیکھتے تو نہ معلوم وہ کیا کہتے اور ان کی جانِ حزیں پر کیا بیتتی! بہرحال، اللہ کا وعدہ ہے کہ قرآنی نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب آکر رہنا ہے۔ اگر یہ سعادت ہمارے حصے میں نہیں آتی، تو دنیا کی کوئی اور خوش بخت قوم اس سے بہرہ یاب ہو گی۔

مجھ سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تمہارا لٹریچر اگر انگریزی زبان میں منتقل ہو جائے تو ان قوموں کیلئے قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ میں اس سے متفق ہوں لیکن میرے سامنے ایک اور پروگرام ہے جو میرا سارا وقت لے لے گا۔ اس لئے میں اس طرف توجہ نہیں دے سکوں گا۔ اگر کوئی اور صاحب یا جماعت اس کام کا بیڑہ اٹھالے تو اس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے۔ میں خود بھی اس نہج پر سوچ رہا ہوں۔

میں نے قرآن فہمی کی جو طرح ڈالی ہے اگر کوئی اور صاحبِ ذوق اسی راہ پر گامزن ہونا چاہیں تو اپنے تجربہ کی بنا پر انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس راہ میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں۔ ان سے محتاط رہنا

راستے کے خطرات

ازبس ضروری ہے۔ سب سے پہلی اور بنیادی احتیاط یہ کہ دل میں پہلے سے کوئی خیال لے کر یا عقیدہ قائم کر کے قرآن کی طرف نہیں آنا چاہیئے۔ ایسا کرنا شرک ہوگا اور شرک عدالتِ خداوندی میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔ کلمۂ طیبہ میں الا اللہ سے پہلے لا الٰہ کے معنی یہی ہیں کہ انسان ہر قسم کے نظریات، تصوّرات، اعتقادات، مسالک و مشارب کو دل سے الگ کر کے خدا کی طرف آئے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ قرآن کبھی سمجھ میں نہیں آسکے گا بلکہ قلب و دماغ اس قسم کی گمراہیوں کی آماجگاہ بن جائیں گے جو انسان کو منزلِ مقصود سے بہت دور لے جائیں گی۔ اقبالؒ نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا تھا کہ:

رہ مدہ اقبالؔ را در کعبہ اے شیخ حرم　　　ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو اپنے قریب نہ آنے دیں جو آپ کے پیغام کے کماحقہٗ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور اسے غلط سمجھیں لیکن باہر جا کر اس غلط مفہوم کو آپ کی طرف منسوب کر کے عام کرتے جائیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ قرآنی پیغام کو اتنا نقصان اس کے اعداء دشمن نہیں پہنچاتے جتنا نقصان اس کے اس قسم کے "نادان دوست" پہنچاتے ہیں۔ یہ خطرہ ایسا مہیب ہوتا ہے کہ اقبالؒ کو اس کیلئے خدا سے خاص طور پر التجا کرنی پڑی کہ:

مئے من از تنک جاماں نگہ دار　　　شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار!

شرر از نیستانے دور تر بہ　　　بخاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

عزیزانِ گرامی قدر! میں نے اپنی قرآنی فکر کی طول طویل مسافت کی مختلف منزلوں کی مختصر الفاظ میں نشاندہی کر دی ہے۔ اس کا شکریہ بدرگاہِ رب العزت باقی ہے لیکن خدا کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے اس کے مخلص بندوں کا شکریہ میرے ذمہ ہے۔ میرے اس سفر کی کیفیت یہ تھی کہ:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر　　　راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

دعائیں

یہ ان مخلص ہمرہانِ سفر کی رفاقت تھی جس نے نہ صرف یہ کہ مجھے اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں ہونے دیا بلکہ میری ہمت اور حوصلہ بھی بڑھائے رکھے۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کا اس سے زیادہ حسین انداز اور کونسا ہو سکتا ہے کہ میں ان کیلئے خدائے بزرگ و برتر سے دعا کروں کہ الٰہ العالمین! تیرے ان بے ساز و برگ بندوں نے بڑے صبر اور استقامت سے اس جادۂ پرخطر میں میرا ساتھ دیا اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مشکلوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا ہے۔ اپنے بندوں کو لا نضیع اجر المحسنین کی نشید جانفزا سے نوازنے والے! تو قافلۂ قرآنی کے ان جادہ پیماؤں کو شرفِ انسانیت کی درخشندہ منزل تک پہنچا دے کہ کاروانِ حیات کیلئے اس سے زیادہ گرانمایہ متاع کوئی اور نہیں۔ یہی وہ متاع ہے جس کے تصوّر سے یہ الفاظ بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں کہ

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　　اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، میں نے شروع ہی سے اپنی قرآنی فکر کا مخاطب قوم کی نئی نسل کے نوجوانوں کو قرار دیا ہے کہ قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ میرے اوّلیں مخاطب بھی یہی تھے اور اب اس منزل پر پہنچ کر یہ دعا بھی انہی کیلئے ہے کہ اے خدائے کرم گستر!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　　میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　　مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری آرزوئیں مری　　　امیدیں مری جستجوئیں مری!

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے　　　لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے

ربّنا تقبل منّا انّک انت السّمیع العلیم۔　　　والسلام

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ایک نئے انداز کا سپاسنامہ

(بشرفِ نظر، استاذِ محترم جنابِ پرویزؒ)

حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ جب خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے تو یہ بات واضح کر دیتے تھے
کہ یہ تمام تر لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے اور اس میں ان حضرات کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں خود بہ زبانِ وحی اُن
سے کہلوایا گیا۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶/۱۲۷)

میں اس بات کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو پروردگارِ عالم پر ہے (اور بس!)
خدا کا پیغام پہنچانے والوں کا ہر دور میں یہی طریق رہا ہے اور ان انبیائے کرامؑ کے ماننے والوں پر بھی سنتِ رسلؑ
کا اتباع لازم ہے۔

محترم پرویز صاحب، پچھلے پچاس سال سے، خدا کے اس آخری پیغام کو جو خدا نے اپنے آخری نبیؐ کی
معرفت دنیا کو دیا اور جسے قیامت تک کے لئے ساری انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا ہے عام کر رہے
ہیں اور اس تمام عرصہ میں اس طرح کہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

بلکہ اس عرصہ کا بیشتر حصہ تو سرکاری ملازمت کا بندھن بھی زنجیرِ پا تھا، گویا ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان کی تجسس پسند طبیعت نے روایتی باتوں سے مطمئن نہ ہو کر حقیقت تک
پہنچنے کی کوشش کی اور خدا کی دی ہوئی روشنی نے ہر چیز اُجاگر کر دی ——— ورنہ جس انداز میں، وہ
بتاتے ہیں کہ ان کی تربیت شروع ہوئی تھی شاید وہ عمر بھر تصوف کی پُراسرار وادیوں میں گم رہتے۔
اسے اس دنیا میں ان کو تو شاید ایک مقام پھر بھی حاصل ہوتا مگر ہم لوگ تشکیک و ریب کے خارزاروں میں
ہی بھٹکتے پھرتے ——— ہم لوگ کہ مسلمانوں کی اولاد کہلاتے ہیں، روحانی ریاضتوں کی مشقتوں سے گزر
کر کسی موہوم منزل تک پہنچنے کی تاب و توانائی رکھتے ہیں نہ فرصت و فراغت، رسماً اور اعتقاداً اسلام کو
ہر مرض کا علاج، ہر دکھ کا مداوا اور انسانیت کے لئے فلاح کا باعث سمجھتے ہیں مگر جب ہم یہ کہتے ہیں تو ہمارے

دل ہماری زبان کے رفیق نہیں ہوتے۔ ہمارے دلوں میں خود اس بات کا یقین اور ایمان نہیں ہوتا۔ وہ تو خود ہر لحظہ لرزاں و ترساں ہوتے ہیں۔ دماغ میں جو سوال اُٹھتے ہیں ان کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ انہیں مبہم فلسفوں کی تھپکیاں دے کر سلا دیا جاتا ہے۔ قرآن کی زبان سے ہم واقف نہیں اور ترجمے ہمیں کوئی ..... راہ نہیں دکھاتے۔ اس لئے ہم، مذہب میں عقل کو کیا دخل کہہ کر، خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہم ـــــ جو اس کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں جو بار بار کہتی ہے، تم سوچتے کیوں نہیں، تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے، تم تدبّر کیوں نہیں کرتے ـــــ جو بتاتی ہے کہ ان باتوں میں اولی الالباب کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اس حالت میں اپنے ذہنی شکوک کا "نتارا" کئے بغیر ہم بس ان پر پردہ ڈال سکتے تھے۔ گویا شرک کی منافقت کی زندگی گزارتے۔

ہماری دنیاوی پس ماندگی نے ہمیں اقوامِ عالم میں ایسا ذلیل و رسوا کر رکھا ہے کہ ہم سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں۔ ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہے۔ جب ہم اپنی پسماندگی دور کرنے کے قابل نہیں۔ یہ کہتے ہوئے ہر لحظہ خطرہ ہے کہ سننے والے کہیں گے، تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو! ہمیں مسائل کا حل بتانے سے پہلے اپنے دکھوں کا، اپنے غموں کا تو کچھ تدارک سوچو ـــــ سوچو، غور و فکر کرو ـــــ اور یہی ہماری چڑ ہے ـــــ غور و فکر ـــــ غور و فکر کو ہم صدیوں سے تج چکے ہیں۔ ہم، جن کے اپنے ہادیؐ و آقا کی زبان سے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں کہلوایا ـــــ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ (۳۴/۴۶)۔

ان اعتراضات سے بچنے کا ہم نے ایک نیا طریقہ سوچا کہ زندگی کے ٹکڑے کر کے کہیں کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی تمہارے لئے، اور اُخروی زندگی ہمارے لئے ـــــ اور پھر بار بار منبر و محراب سے دہرائیں۔ خانقاہوں اور پیرانِ طریقت کی گدیوں سے یہ آوازیں تقدس میں ڈوبی ہوئی صدائیں بن کر سنائی دیں کہ اس دنیا کی زندگی تو حقیر و ذلیل ہے۔ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے ـــــ مگر جس کتابِ عظیم پر ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں وہاں تو ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا اٹھایا جائیگا۔ ہم بھول جاتے ہیں زندگی کو یوں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، یہ تو اک جوئے رواں ہے ؎

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

اور ہمارا خدا تو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بدلے اس دنیا میں سرفرازیوں اور استخلاف فی الارض کی خوشخبری دیتا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (۲۴/۵۵)۔ مومن کی تو دعا بھی فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً سے پہلے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ہے۔

ہم حیران و سرگرداں تھے کہ ـــــ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند۔ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں، ـــــ یہ ہمیں پرویز صاحب نے ہی بتایا کہ "اسبابِ زوالِ اُمت" کیا ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں وہ "جوئے نور" رواں دکھائی جہاں انبیائے کرامؑ کے نقوشِ پا کے طفیل ہر اک راہ کہکشاں نظر آئی۔

انہی کی چشم بینا نے ہمیں "برقِ طور" کی طرف راہ نمائی کی۔ اور انہی کی دور رس نگاہوں نے "شعلۂ مستور" کو چھپائے ہوئے پردوں کو ہٹایا تاکہ ہمارے ذہن اس کی اصل دیکھ پائیں ——— انہوں نے ہی عقدۂ "تقدیر" کی گتھیوں کو اپنی بصیرت سے سلجھایا۔ جس کے گنجلکوں میں یہ اُمت صدیوں سے حیران و پریشان چلی آ رہی تھی۔ انہی نے اقبالؒ کے لفظوں میں یہ پیغام خود آگہی دیا، کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں۔ صاحبِ اختیار و ارادہ انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر قادر ہے۔

پرویز صاحب نے دین اور دنیا کی ثنویت کے پردے میں چھپی اس چال سے پردہ ہٹایا جو ملوکیت اور پاپائیت کی راہیں کھولتی اور مقام استوار کرتی ہے۔ انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ مذہب رسوم و عبادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دین ایک زندہ و پائندہ توازن بدوش معاشرے کی حسن کارانہ تخلیق کا نام ہے۔ مذہب، زندگی کو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے اور خود اس کا صرف ایک حصّہ ہے، جبکہ دین ایک نظامِ زندگی ہے جو حیات کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ زندگی کا ہر مسئلہ اپنی عقدہ کشائی کے لئے دین ہی کی کلید کا مرہونِ منّت ہے۔ (از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد)۔

آپ نے ہی سرمایہ داری اور کمیونزم، دونوں سے حیران انسانیت کو اس نظامِ ربوبیت کی جھلک دکھائی۔ جس کے مطابق نظام قائم کرکے انسان اپنی گم گشتہ جنت کا سراغ پا سکتا ہے، ایک ایسا معاشرہ جس میں نہ کوئی بھوکا رہتا ہے اور نہ ننگا، نہ ہی بے گھر اور بے سہارا۔ جس معاشرے میں کوئی یتیم اور بے آسرا نہیں۔ ایک ایسی سوسائٹی جہاں ہر کوئی کام کرتا ہے اور بغیر کسی جبر کے، بہ رضا و رغبت، بطیبِ خاطر، کام کرتا ہے۔ اور جہاں کوئی زبردست کسی زیردست کی محنت کا ماحصل چھین کر اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ جو "اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے" کا اعلان کرتا ہے۔ جو دنیا کے ہر انسان کو واجب التکریم قرار دیتا ہے اور یوں دنیا کے سب منشوروں سے زیادہ ترقی پسند منشور دیتا ہے ——— جہاں انسانی عقل کی معراج ——— عدل ——— پر ہی نہیں "احسان" پر بھی عمل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ (WELFARE STATE) کسی کے تصور میں آ سکتی ہے؟ اور پھر جہاں ہر کوئی، دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھتا ہے بلکہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے۔ محنت کے ماحصل میں اتنا ہی اپنا حصہ سمجھتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔

ان کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ اب مختلف گوشوں سے جو آوازیں اٹھتی سنائی دیتی ہیں وہ اسی ایک آواز کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ آج ہر سٹیج سے (بلا سوچے سمجھے ہی سہی) یہ کہا جا رہا ہے کہ دین مکمل نظامِ حیات ہے۔ ایسے ایسے گوشوں سے بھی یہ آواز سننے میں آ رہی ہے جو نہیں سمجھتے کہ یہ مکمل نظامِ حیات ان کی موت کا پیغام ہے۔ کیونکہ وہاں زندگی میں ثنویت نہیں ہو گی اور ان کی اپنی سیادت کا دار و مدار ہی اس ثنویت پر ہے۔ دین میں ملائیت اور پاپائیت نہیں ہوتی ——— آج فرقوں کے وجود کو معذرتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ ملّت کو بانٹتے ہیں، تفرقہ ڈالتے ہیں اور تفرقے سے اس اُمت کو خبردار کر دیا گیا ہے۔

کل تک اُمت کی اکثریت ذاتی ملکیت کے تقدس کی قائل تھی۔ بے حد و حساب دولت اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت عین اسلام بنا کر پیش کی جا رہی تھی۔ آج ملکیت کی حد مقرر کر دینے کی بات ہو رہی ہے۔ آج ہر اسٹیج سے زمین کی حدِ ملکیت مقرر کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ کل اجتماعی ملکیت غیر اسلامی تھی، آج سرکاری ملکیت میں لی گئی صنعتوں کی واپسی غیر ممکن اور غیر دانشمندانہ قدم قرار دی جا رہی ہے۔ سچ ہے۔

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے

پرویز صاحب پر بہت سے الزام لگائے گئے۔ ان کے خلاف بہت سے فتوے دیئے گئے۔ بہت کچھ کہا گیا۔ تین نمازوں اور نو روزوں کے مضحکہ خیز جھوٹے الزامات سے لے کر منکرِ شانِ رسالتؐ تک کہا گیا۔ مگر انہوں نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی جگمگاتی ہوئی سیرت پر "معراجِ انسانیت" جیسی کتاب لکھ کر دنیا کو پیش کرنے کی سعادت پائی۔

بارگاہِ رسالتؐ کے تربیت یافتہ ایک عظیم انسانؓ کی سیرت "شاہکارِ رسالت" کی شکل میں دی۔ جس میں اسلام کے خلاف کی گئی عجمی سازش کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے گئے۔ خدا کی عظیم کتاب کو سمجھنے کے لئے لغات جیسی حقیقت کشا کتاب ہی مرتب نہیں کی بلکہ اس لغت کی روشنی میں پورے قرآن مجید کا مفہوم بھی سمجھایا۔

لفظ اپنے اندر کیا کیا معنی پنہاں رکھتے ہیں، اور لفظوں کا صحیح سمجھنے سے کتنی گتھیاں سلجھتی ہیں، کتنی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور کتنی راہیں آسان ہوتی ہیں، یہ پرویز صاحب کی اس عظیم کتاب ہی سے سمجھ میں آیا ——— پہلی بار پتہ چلا کہ صلوٰۃ کا مفہوم کتنا وسیع ہے۔ تسبیح سے کیا مراد ہے۔ شکر کیا ہوتا ہے۔ ذکر کسے کہتے ہیں۔ تقویٰ کیا ہوتا ہے۔ متقی کسے کہتے ہیں۔ عالم کہلانے کا حقدار کون ہے۔

میرا یہ مقام نہیں کہ میں ان عظیم فکری، ادبی اور ملّی کارناموں کی عظمت کے متعلق کچھ کہوں۔ میرا علم بڑا محدود ہے۔ اس کام کا بیڑہ تو زیادہ پڑھا لکھا انسان ہی اُٹھا سکتا ہے۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے ——— میرا تو یہ حال ہے کہ جب اپنی ایک کتاب ان کو پیش کرنا چاہی تو یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ کیا کہہ کر پیش کروں۔ آخر کہا کہ شرمندہ ہوں کہ کسے کیا پیش کر رہا ہوں۔

ایک قطرہ یا ایک لہر کی کیفیت ہی کیا کہ سمندر کو خراجِ عقیدت پیش کرے۔ مگر وہ سمندر ہی کیا جس میں وسعتِ قلب و نظر نہ ہو۔ کشادگیٔ ظرف و نگاہ نہ ہو۔ انہوں نے میری بات کا جواب دیا ؎

برآور ہرچہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

اور یوں میں اپنی نگاہوں میں چھوٹا بننے سے بچ گیا۔ یہی بڑے آدمی کی نشانی ہوتی ہے، انہوں نے باوجود تبحرِ علمی کے کبھی بڑ نہیں ماری۔ لاف زنی نہیں کی۔ کبھی اپنے آپ کو (AUTHORITY) نہیں کہا۔ وہ اکثر کہتے ہیں اور اپنی کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ قرآنی آیات کا یہ مطلب و مفہوم وہ اپنی بصیرت کے مطابق بیان

کر رہے ہیں۔ یہ حرفِ آخر اور منزہ عن الخطا نہیں۔ ان کی سوچ کو انہی کی تحریر کے آئینے میں اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ "جہانِ فردا" کے پیش لفظ سے ایک اقتباس:۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی قرآنی فکر کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے قریب آئیں اور اس پر از خود غور و فکر کریں۔ وہ اس طرح تدبر فی القرآن سے اگر کسی ایسے نتیجے پر پہنچیں جو میری فکر سے مختلف ہے تو نہ صرف یہ کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ میں ان حقائق پر دوبارہ غور کروں گا۔

وہ تو اس راہ پر اس لئے چلے ہیں کہ بعد کو آنے والے ان وادیوں میں آئیں تو انہیں یہ نقوشِ پا دیکھ کر ڈھارس بندھے کہ:۔

سرخیٔ خارِ مغیلاں یہ پتہ دیتی ہے
تیرے دیوانے اِدھر آئے، یہاں تک پہنچے

انہیں یہ معلوم ہو کہ اس وادیٔ پُر خار میں پہلے بھی کوئی آبلہ پا آیا تھا۔ یوں سونے کی بجائے وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نئی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔

والسلام

مطالب الفرقان جلد ششم

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات (۱۵۹ تا ۲۰۶)، سورۃ الفال کی کل آیات (۱ تا ۷۵)، سورۃ توبہ کی کل آیات (۱ تا ۱۲۹) سورۃ یونس کی کل آیات (۱ تا ۱۰۹) اور سورۃ ھود کی کل آیات (۱ تا ۱۲۳) آگئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں۔ حضراتِ انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالب الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کس طرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے (۴۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے
کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش
قیمت فی جلد -/۷۵ روپے۔ محصول ڈاک -/۸ روپے

ملنے کا پتہ
(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور
(۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

فرقۂ اہلِ حدیث، صحیح احادیث کا منکر ہے!

علامہ پرویز صاحب مرحوم کے بارے میں ان کے مخالفوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ وہ حدیث کے منکر ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ ایسے منظم طریقے سے کیا گیا کہ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ، اس کا یقین کرنے لگے۔ حالانکہ حقیقتِ حال اس کے برعکس تھی، حنفی فقہ کے بانی امام ابو حنیفہؒ کی طرح، پرویز صاحب کا بھی حدیث پرکھنے کا معیار بڑا سخت تھا۔ وہ ایسی تمام احادیث کو جو قرآنِ مجید کی تعلیمات اور علمی تحقیق کے مطابق ہوتیں، کو تسلیم کرتے اور طلوعِ اسلام میں انہیں بطور حوالہ پیش کرتے تھے۔

اس کے برعکس وہ حضرات جنہوں نے آپ کے خلاف منکرِ حدیث کا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ ایسی کسی حدیث کو تسلیم نہیں کرتے، جو اُن کے مفاد کے خلاف ہوتی ہے، چاہے وہ حدیث قرآنی تعلیمات، آئمہ حدیث کے اصولوں اور علمی تحقیق کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ حد یہاں تک ہے کہ فرقۂ اہلحدیث جو فقہ کی پیروی کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ اور پرویز صاحب کے خلاف پروپیگنڈے میں برابر کا شریک تھا، کا طرزِ عمل بھی کوئی مختلف نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو گی:۔

جب سود کی حرمت کے احکام نازل ہوئے تو رسول اللہ صلعم باہر کھیتوں اور منڈیوں میں تشریف لے گئے تاکہ معلوم کریں کہ کون سے تجارتی معاملات اس کی تعریف میں آتے ہیں، خیال رہے کہ ان دنوں بینک وغیرہ نہیں تھے، لیکن آج صرف بینک کے سود کو حرام سمجھا جاتا ہے اور جن دوسرے معاملات میں رسول اللہ صلعم نے خود سود کی نشاندہی فرمائی تھی، ان کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دیتا۔

اس مقصد کے لئے جب آپؐ کھیتوں میں تشریف لے گئے تو ایک کھیت میں ایک صحابی رافع بن خدیج آپ کو ملا، جو کھیت کو پانی دے رہا تھا۔ آپ نے اس سے کاشت کے معاملے کی تفصیلات پوچھیں تو حضرت رافع بن خدیج نے بتایا کہ زمین فلاں شخص کی ہے اور میں اس پر کاشت کر رہا ہوں جب فصل تیار ہو گی تو آدھی مالکِ زمین کو دے دی جائیگی۔

اور آدھی میں خود رکھ لوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تم دونوں یہ تو سود کا کاروبار کر رہے ہو زمین مالک کو واپس کر دو اور اپنی مزدوری اس سے لو۔ یہ حدیث ابن ابی نعیم نے بیان کی ہے اور سنن ابوداؤد (مطبوعہ مصر (چار جلدوں) کی تیسری جلد کے صفحہ ۲۵۵ پر موجود ہے۔

امام ابوداؤد نے اسی باب میں ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:۔

"حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص زمین کی بٹائی کا معاملہ چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔" (ایضاً)

قرآن مجید میں سود کی حرمت کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

زمانۂ جدید کے ماہرین معاشیات نے سود کی جو تعریف متعین کی ہے، اس کے مطابق زمین کی بٹائی کا معاملہ سود کی تعریف میں آتا ہے۔ جسے ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً کوئی سرمایہ دار اگر اپنا ایک لاکھ روپیہ بینک میں جمع کرائے تو اسے بینک سے جو منافع ملتا ہے وہ سب کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن اگر وہ سرمایہ دار اسی ایک لاکھ روپے کی اراضی خرید کر، کسی کاشتکار کے حوالے کر کے، بینک کے سود سے بھی زیادہ منافع بٹائی کی شکل میں وصول کر لیتا ہے۔ تو وہ کس طرح سود کی تعریف سے خارج ہو گا۔ اس تشریح کی روشنی میں، زمانۂ جدید کے عظیم ماہر معاشیات لارڈ کینز نے سود کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔

"وہ اعلیٰ معاوضہ جو قدیم زمانے میں اراضی پر اور عہد حاضر میں سرمائے پر وصول کیا جاتا ہے۔" (اسلام اور سود از انور اقبال قریشی صفحہ ۸۹)

زمین کی بٹائی کے معاملے کے بارے میں اوپر جو دو احادیث نقل کی گئی ہیں، آئمۂ حدیث کے نزدیک ان کی اسناد صحیح ہیں، مختصر یہ کہ زمین کی بٹائی، قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق بھی سود کی تعریف میں آتی ہے، اور خود رسول اللہ صلعم نے بھی اسے اپنی زبان مبارک سے سود ہی قرار دیا اور موجودہ دور کی علمی تحقیق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس لئے پرویز صاحب ان احادیث کو صحیح تسلیم کرتے تھے۔

اس کے برعکس فرقۂ اہلحدیث کو لیجئے، اس فرقے کے اب مزید کئی ٹکڑے ہو چکے ہیں ان ٹکڑوں کا چھوٹے چھوٹے معاملات میں اختلاف ہے، لیکن مذکورہ بالا دونوں صحیح احادیث تسلیم نہ کرنے پر ان کا اتفاق ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس فرقے کے جتنے سرکردہ لیڈر ہیں یا تو وہ خود زمیندار ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے مطابق مزارعوں سے اپنے سرمائے (زمین) کا سود وصول کرتے ہیں۔ یا وہ بڑے زمینداروں کے رہین منت ہیں اس لئے ان میں سے کوئی بھی ان صحیح احادیث کو تسلیم نہیں کرتا، جس سے کروڑوں انسانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ان حضرات کے نزدیک حدیث سے مراد غالباً صرف "آہستہ یا بجہر" اور "رفع یدین" والی احادیث ہیں اور انہی کی بنیاد پر وہ امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والوں سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث امت مسلمہ کے لئے رحمت ہی رحمت ہیں انہیں یہ حضرات تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ ان صحیح احادیث کو تسلیم کرنے سے ان کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے۔

(از محمد شاہد عادل)

برقِ طور

آسمانی انقلاب کے داعیان، انبیاء کرام کے سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں ایک طرف صاحب ضربِ کلیم (حضرت موسیٰؑ ہیں) اور استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ فرعون.... مذہبی پیشوائیت کا سرغنہ ہامان اور نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ قارون دوسری طرف.... اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان بڑے عبرت آموز انداز میں سامنے لائی گئی ہے۔ بڑی بصیرت افروز اور حقائق کشا تصنیف ہے۔

بڑا سائز ضخامت ۳۳۶ صفحات، کاغذ اعلیٰ جلد مضبوط مزین اور مطلا

قیمت فی جلد -/۶۰ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور